معارف

ستمبر ۲۰۲۱ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۳۰؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰؍روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

✆ (Ma'arif Section) 06386324437

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری؍منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۸ ماہ محرم الحرام ۱۴۴۳ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۲۱ء عدد ۳

فہرست مضامین

(مرتبہ)

اشتیاق احمد ظلی
محمد عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

وسط ہند کا یوں تو پورا خطہ ہی دست قدرت کی عظیم اور بے مثال خطاطی کا نمونہ ہے جہاں دشت و کوہ و دریا، کاتب ازل کے ایسے مضامین ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لیے اگر دل نہیں اور جن کی صداؤں کو سننے کے لیے سماعتیں نہیں تو قصور ان قدرتی تحریروں کو نہ دیکھ پانے والی آنکھوں کا نہیں، بلکہ یہ ان دلوں کی نارسائی اور بے بصیرتی ہے جو صرف سینہ کے زندان میں محبوس ہیں، ان مناظر قدرت کی سیر اگر مطلوب ہو تو سفر کے مقصود کا تعین بھی ضرور ہو۔ وسط ہند یا آج کی زبان میں مدھیہ پردیش میں دو دریاؤں اور دو پہاڑی سلسلوں یعنی دریائے نربدا اور دریائے تاپتی اور ان کے درمیان مالوہ، مانڈو اور برار و برہان پور کی بستیاں اپنے وندھیا اور ست پڑا پہاڑوں کے حصار میں صدیوں سے عجب عجب داستانیں لکھتی اور سناتی رہی ہیں، ایسے دشوار گزار راستے، ایسے ناقابل بیان نشیب و فراز، بلندیوں اور پستیوں کے ہر قدم پر نظارے اور پھر کالی مٹی میں چاندنی بکھیرتی فصلیں اور دامن کہسار میں شہد جیسے شیریں پھل، راستہ بھر سیاحوں کو دعوت دید ہی نہیں دیتے کچھ شنید کی بھی توقع کرتے ہیں۔ ایسی ہی امیدوں میں جینے والی ایک بستی برہان پور بھی ہے، ہندوستان میں رام پور بھی دار السرور کہلاتا ہے لیکن بہت پہلے شاہ جہاں نے دہلی میں رہ کر برہان پور کو دار السرور کا خطاب دیا، یعنی مغل عہد ہی میں جبکہ نئے شہر آباد و آراستہ کیے جا رہے تھے اس وقت برہان پور کو دار السرور ہوئے سوا دو سو برس ہو چکے تھے، سلطان فیروز شاہ تغلق کے ایک حوصلہ مند درباری ملک احمد راجہ نے قریب ساڑھے چھ سو سال پہلے فاروقی النسل بادشاہ کی شاید دنیا میں اکلوتی سلطنت قائم کی، تیرہ بادشاہوں کے زیر سایہ برہان پور آخر کار ۱۶۰۰ء میں جلال الدین اکبر کی طاقت کی تاب نہ لا سکا، حکومت تو جاتی رہی لیکن اس خاندیسی حکمرانی نے محلوں، مسجدوں، قلعوں، باغوں، چشموں کی ایک جنت ایسی تیار کر دی کہ ایک طرف فصیلوں کے نیچے دریائے تاپتی کی لہریں اتراتی تھیں تو دوسری جانب ست پڑا پہاڑوں کی قدرتی فصیل اپنی عظمتوں کی سربلندی کا اعلان کرتی تھی، ایک سیاح کے لیے ان مناظر سے جدا فاروقی سلطنت کے سلیقہ جہاں بانی میں وہ کشش ہے جو شاید تاج محل اور لال قلعہ اور گولکنڈہ و دولت آباد سے بھی کچھ دیر کے لیے نظریں ہٹا دے۔ برہان پور کہتے ہیں کہ خواجہ نظام الدین اولیا کے ایک مرید قریب خواجہ برہان الدین غریب کے نام نامی سے موسوم ہوا، برکت ہی تھی کہ وہاں کی جامع مسجد آج بھی فن تعمیر کا وہ لازوال اور حیرت انگیز نمونہ ہے جو الفاظ میں منتقل ہی نہیں ہو سکتا، بغیر چھت کے صرف کمانوں اور محرابوں کے جادوئی زاویوں پر ہر

طرح سے محفوظ یہ مسجد عادل شاہ فاروقی کے ذوق فن کا وہ معجزہ ہے، جس کی نمود خون جگر کے سوا اور کسی شے سے نہیں، تین ہزار نمازی صرف اندرونی حصہ میں آسکتے ہیں، سنگ خارا سے بنی اس مسجد میں امام کی محراب میں ایسی تکنیک کہ کسی آلہ کے بغیر امام کی آواز مسجد و صحن مسجد میں یکساں طور پر پہنچ جائے، محرابوں کی یہ شان کہ ہر محراب کی بناوٹ الگ، سیاح کو سحر زدہ کرنے کے لیے سات صدیوں پہلے کا یہ معجزہ فن ہی کافی ہے لیکن برہان پور تو اپنے دامن میں اندلس وترکی سے ایشیائے کوچک تک کے سارے مسلم ثقافتی کارناموں کا جیسے مکمل ومبسوط اشاریہ ہے، دھارنی سے برہان پور آتے آتے جہاں کپاس اور کیلے کے سرسبز و شاداب کھیت باتیں کرتے نظر آتے ہیں کہ اے ان راستوں سے بہ آسانی گزرنے والو، کبھی ان کو بھی یاد کرلو جنہوں نے اپنے دلوں کی تپش اور شبوں کے گداز سے ایسے ناہموار اور سنگلاخ علاقہ کو ایران وخراسان کے پھلوں سے جنت نظیر بنادیا، مسجدوں اور حماموں، سرایوں، مقبروں کی شکل میں تاریخ نے کیسے کیسے پائیدار نقوش ثبت کیے، سب سے بڑھ کر قلعہ اسیر گڑھ، سطح زمین سے قریب ایک ہزار فٹ کی بلندی پر یہ قلعہ شاید ہندوستان کا سب سے مستحکم، سب سے محفوظ اور سب سے پائیدار قلعہ تھا، جس کو فتح کرنے اور بہادر شاہ فاروقی کو شکست دینے میں اکبر اعظم کی طاقت ور ترین فوج کو قریب ایک سال لگ گیا، قلعے آج بھی ہے مگر محلوں کی ناپائیداری کے ساتھ قلعہ کی سب سے بڑی مسجد کچھ عجیب ہی عالم میں پہنچادیتی ہے، پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر ایسی عظیم الشان مسجد جس کے منارے میلوں دور سے اعلان کرتے ہیں کہ یہ بھی ان مناروں میں ہیں جو جلوہ گہ جبرئیل کے لائق ہیں اور جہاں کی اذانوں سے کبھی سر کلیم و خلیل فاش ہوا کرتے تھے، قلب ہند میں بلند ترین یہ مسجد اور اس کے منارے وہ سب کچھ کہتے ہیں جو تاریخ کی کتابیں خواہ وہ تاریخ فرشتہ ہو یا مآثر رحیمی کبھی کہہ نہیں سکتیں، برسبیل تذکرہ یہ بھی کہ برہان پور اور اسیر گڑھ کے کتبوں کی تصحیح و ترجمانی سے اردو دنیا پہلی بار معارف ہی سے واقف ہوئی، معین الدین ندوی برہان پوری کے ان مضامین کا مجموعہ اسرار انصاری صاحب نے شائع کردیا۔ ہاں تو مکانوں کے ساتھ مکینوں کی عظمت بھی اسی درجہ کی تھی، علی متقی جیسے محدث اور شیخ باجن چشتی جیسے صوفی، شاہ عیسیٰ جنداللہ جیسے حکیم اور خواجہ محمد ہاشم کشمی جیسے شاعر سب کے سب انسان ساز تہذیب اسلامی کے صناع و معمار اور عبدالرحیم خان خاناں اور ابوالفضل جیسے بے نظیر ارباب علم و فضل، برہان پور کو قرطبہ واشبیلیہ اور سمرقند و بخارا اور بغداد و دہلی کا مجموعہ عطر شہر اگر بناتے ہیں تو حیرت کیا، شیخ علی متقی کی سرائے ان چار سرایوں میں سے ہے جو برہان پور کے چاروں اطراف میں تھیں، آج بھی لگتا

ہے کہ دنیا کے طالبان حدیث اس سرائے کے در و بام اور دالان و صحن کو علم حدیث کی نواؤں اور صداؤں سے مانند حرم بنانے میں مصروف ہیں، قریب میں وہ قبرستان بھی ہے جہاں سینکڑوں محدثین مدفون ہیں، چالیس کے قریب قبریں ہیں جن میں کچھ آج بھی اصل شکل میں ہیں، شیخ باجن چشتی کو اردو کے قدیم ترین اور اولین شاعر کی حیثیت سے بھی یاد کیا جاتا ہے، برہان پور والوں سے کہنے والوں نے یہی کہا کہ اتنی عظیم وراثت کو سنبھالنے والے وارث کہاں گئے، کہاں گئے وہ مہندسین جنھوں نے نہر آب خوش گوار کی شکل میں آب پاشی کا وہ نظام قائم کیا جس کی مثال اب تک سارے عالم میں نہیں، کہتے ہیں کہ کنڈی بھنڈارا ایک چشمہ کا پانی سو سے زیادہ کنوؤں کی ترتیب وار شکل کے ذریعہ پورے شہر کو سیراب کرتا تھا، کسی نے کہا کہ نئی تحقیق میں زمزم کے بعد سب سے زیادہ صحت بخش اسی پانی کو قرار دیا گیا، کہاں تک بیان کیا جائے کہ یہ شہر صنعت و حرفت میں بھی بے مثال تھا، پارچہ بافی کی سب سے بڑی منڈی صرف یہیں تھی، ہتھیار یہاں بنتے، آہوخانہ سے زین آباد تک تاریخ کا ہر صفحہ قدرت کے قلم و قرطاس کی عظمتوں کا ایسا شاہد شاید ہی کہیں اور ملے، سات سو سال پہلے وہ پراسرار بندے کون تھے جن کی ہیبت سے یہ پہاڑ سمٹ کر رائی بن گئے تھے، ان کے وارث تو اب بھی ان ہی گلی کوچوں میں ہیں، پھر یہ آہوخانے ویران کیوں؟ بس یہی کہہ سکتے ہیں ۔

آب روان تاپتی! تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

برہان پور کے اس ذکر کا سبب دھارنی امراوتی میں قدیم ابنائے ندوہ کا ایک جلسہ ہوا، جس میں خاندیس کے جناب رفیق شاد ندوی، مولانا سید سلیم ندوی، ڈاکٹر محمد سلیم گوری کی دعوت پر بھوپال کی تاج المساجد کا ایک قافلہ پروفیسر حسان خاں کی امارت میں شریک ہوا۔ کل دو دنوں کی سیاحت تھی لیکن یہ صدیوں کے بند دریچے کھول گئی، برہان پور میں نعتیہ مشاعرہ کی شب اس سفر کی قبولیت کی علامت تھی جہاں صبح جامع مسجد کے صحن سے ہوئی اور رات ذکر رحمت للعالمینؐ سے شب قدر بن گئی محسوس ہوا کہ اب بھی شعرائے برہان پور کی نواؤں میں رنگ حجاز ہے اور بوئے یمن بھی۔ رفیق شاد ندوی شبلی کے پرستار ہیں، سرزمین خاندیش پر ادارہ تحقیقات شبلی قائم کرنے کا عزم ہے۔ شبلی کی زندگی اور کیا تھی، بس کھوئے ہوؤں کی جستجو۔

قارئین کو اس اطلاع سے یقیناً خوشی ہوگی کہ دارالمصنّفین کی جدید ترین مطبوعات، ”محمد علی ذاتی ڈائری (حصہ دوم)، مرزا دبیر کی شاعری اور تصانیف سرسید۔ ایک تحقیقی مطالعہ“ اب شائقین کے لیے خوبصورت شکل میں دستیاب ہیں۔

مقالات

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تفسیری، حدیثی اور دیگر خدماتِ علمی پر ایک نظر

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی ☆

(۴)

فتاویٰ عزیزیہ کی پہلی طباعت: فتاویٰ عزیزیہ کا مجموعہ سب سے پہلے مطبع مجتبائی دہلی نے شوال ۱۳۱۱ھ (مئی ۱۸۹۴ء) میں شائع کیا تھا، اس نسخہ کی اساس مولانا خلیل الرحمٰن برہان پوری مقیم حیدرآبادی کے مملوکہ خطی نسخہ پر تھی، اس کی تصحیح و مطابقت مولانا محمد احسن نانوتوی نے کی تھی جو حضرت شاہ ولی اللہ اور خاندان ولی اللّٰہی کی کتابوں کے ماہر پارکھ اور ناشر تھے۔ مطبع مجتبائی کی اس طباعت کے آخر میں درج ذیل الفاظ میں اس کی صراحت ہے:

> ”فالحمد للہ علی ذلک کہ بتوجہات کامل و اکمل فاضل اجل مجموعۂ خوبی ہائے بیکراں مولانا خلیل الرحمان صاحب برہان پوری حال وارد بلدۂ حیدرآباد، دکن حفظہ اللہ عن شرور الزمن و الفتن حسب تمنائے دلی حاصل گردید، پس بہ موجب آں کہ السعی مني و الاتمام من اللہ تعالیٰ آں مجموعہ را باَسرع اَزْمِنَہ بتصحیح حضرت مولانا مولوی محمد احسن صاحب مدظلہ العالی و بہ حسن سعی کارپردان مطبع از حلیہ طبع محلی ساختہ، پیش کش ناظرین و شائقین کردہ آمد“۔ (۷۴)

مطبع مجتبائی کی پہلی طباعت شوال ۱۳۱۱ھ (مئی ۱۸۹۴ء) کی ہے، یہ اشاعت دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد کے ۲۴۸ صفحات ہیں جس میں صفحہ ۲۴۳ سے ۲۴۸ تک فہرست عناوین ہے، جلد دوم بھی اسی مطبع سے ۱۳۱۴ھ (۹۷-۱۸۹۶ء) میں شائع ہوئی تھی، جس کے کل ۱۴۷ صفحات ہیں۔

☆ E-mail: nhrashidkandhlavi@yahoo.com

طبع دوم: مجتبائی کی دوسری طباعت ۱۳۲۲ھ (۵-۱۹۰۴ء) کی ہے، یہ بھی دو جلدوں پر مشتمل ہے، جلد اول کے ۲۳۶ صفحات ہیں۔ جلد دوم کی پہلی طباعت صفر ۱۳۲۶ھ (اپریل ۱۹۰۸ء) میں ہوئی تھی، کل ۱۵۲ صفحات ہیں۔

اس کے بعد مطبع مجتبائی سے فتاویٰ عزیزی کئی بار چھپی اور اب تک اس کے عکس (Re-print) چھپتے رہتے ہیں۔

اردو ترجمے: فتاویٰ عزیزی تمام تر فارسی یا عربی میں ہے، اس کے اردو ترجمہ کی بڑی ضرورت تھی جس پر کئی لوگوں نے توجہ کی، فتاویٰ عزیزیہ کے اردو میں کم سے کم تین ترجمے کیے گئے۔

پہلا ترجمہ: یہ ترجمہ مولانا عبدالجلیل نعمانی صاحب اور مولانا نواب علی صاحب نے مشترک کیا تھا، پہلی مرتبہ مطبع کنز العلوم حیدرآباد سے ۱۳۱۳ھ (۹۶-۱۸۹۵ء) میں شائع ہوا تھا، دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول کے ۴۶۳ صفحات ہیں، جس میں آخر کے چار صفحات پر فہرست عناوین ہے اور ابتدا میں پانچ صفحات پر مشتمل اغلاط طباعت بھی شامل ہے۔

دوسرا ترجمہ: فتاویٰ عزیزی کا دوسرا ترجمہ مولانا عبدالواجد منولوی غازی پوری نے حاجی محمد سعید صاحب کلکتہ کی فرمائش سے کیا تھا، یہ بھی دو جلدوں میں ہے۔ جلد اول ذی قعدہ ۱۳۲۳ھ (جنوری ۱۹۰۶ء) میں فخر المطابع لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی، جو ۵۴۲ صفحات پر ہے۔ چند ماہ بعد اسی مطبع سے دوسری جلد ربیع الاول ۱۳۲۴ھ (مئی ۱۹۰۶ء) میں چھپی، جو ۳۵۲ صفحات میں ہے۔

تحفۂ اثنا عشریہ: حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے عہد میں، شمالی ہندوستان میں جو مسئلے، مسلمانوں کے لیے خطرہ اور پریشانی کا سبب بنے ہوئے تھے، ان میں سے ایک، شیعیت کا فروغ اور اہل سنت کے، بڑی تعداد میں شیعیت کی طرف مائل ہونے کا تھا۔ مغلوں کے آخری دور حکومت میں بڑے عہدوں پر شیعوں کے تقرر اور ان کے ہاتھ میں زمام اقتدار آ جانے کی وجہ سے، ان کو اس کا بہت موقع مل گیا تھا کہ وہ اہل سنت پر ہر طرف سے دباؤ ڈالیں، اپنی سیاسی قوت و اثرات کا استعمال کر کے اہل سنت کو اپنا مسلک چھوڑ کر شیعہ ہونے پر مجبور کر دیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز دونوں نے، اس خطرہ کو بہت گہرائی سے جانچا، پرکھا اور اس کے خلاف مسلسل جدوجہد کرنے، مضبوط باندھ لگانے کی ہمیشہ کوشش فرمائی، جس میں دونوں

حضرات پوری طرح کامیاب بھی رہے۔حضرت شاہ ولی اللہ نے إزالة الخفاء، قرة العینین فی تفضیل الشیخین، الھدیة السَنیة فی إنتصار الفرقة السُنّیة جیسی بلند پایہ کتابیں تصنیف فرما کر شیعیت کے بڑھتے سیلاب کو روکنے کی بڑی اور نہایت کامیاب کوشش فرمائی،حضرت شاہ عبدالعزیز نے بھی اس روایت اور خدمت کو اہتمام سے آگے بڑھایا،اس کے لیے زبانی اور قلمی دونوں طریقوں سے پرزور جدو جہد کی، اس سلسلہ میں فتاویٰ لکھے، رسائل تحریر فرمائے، وعظ وتقریر کے ذریعہ سے،اس کی کمزوریوں کو واضح کیا اور عملاً جو کچھ ہوسکتا تھا،اس کے لیے عملی جدو جہد بھی فرماتے رہے،شاہ صاحب کے اس موضوع پر، جو بڑے کارنامے یادگار ہیں،ان میں تحفہ اثنا عشریہ سرفہرست ہے،جس کی وجہ تالیف کی شاہ صاحب نے خود تحفہ کی تمہید میں صراحت فرمائی ہے،جو اس طرح ہے:

”غرض از تسوید ایں رسالہ وتحریر ایں مقالہ آں است کہ دریں بلاد کہ ماساکن آنیم و دریں زمان کہ مادر آنیم، رواج مذہب اثنا عشریہ و شیوع آں بحدی اتفاق افتادہ کہ کم خانہ باشد کہ یک دو کس ازاں خانہ بایں مذہب متذہب نباشند، وراغب بایں عقیدہ نشوند، لیکن اکثرے از حلیۂ علم تاریخ واخبار خود جاہل واز احوال اصول واسلاف خود بےخبر و غافل می باشند؟ وہرگاہ در محافل ومجالس بااہل سنت وجماعت گفتگو می نمایند، کج مج می گویند وشتر گربہ می آرند حسبۃ للہ تعالیٰ بہ تحریر ایں رسالہ پرداختہ شد، تا در وقت مناظرہ از جادۂ خود بیروں نروند، واصول خود را منکر نشوند و در بعضے از امور واقعی شک و تردد را، راہ نہ دہند“۔(۷۵)

اس رسالہ کی تسوید اور اس مقالہ کی تحریر سے غرض یہ ہے کہ ان شہروں میں، جن میں ہم لوگ رہتے ہیں، اس زمانہ میں کہ جس میں ہم موجود ہیں، مذہب اثناعشری (شیعیت) کا اس قدر اثر بڑھتا جارہا ہے کہ کم گھر ہوں گے کہ ان گھروں میں سے ایک دو لوگ،اس مذہب شیعہ سے وابستہ نہ ہوگئے ہوں، یا اس عقیدہ کی طرف راغب نہ ہوں،لیکن اکثر لوگ علم تاریخ اور اپنے احوال سے بےخبر اور اپنے اصول واپنے اسلاف کے تذکروں سے غافل ہیں،کبھی کبھی اہل سنت کی محفلوں میں اہل سنت والجماعت سے کرتے ہیں اور ٹیڑھی میڑھی باتیں کہتے ہیں،جس میں ادھر سے ادھر کے جوڑ ملاتے رہتے ہیں (اس ضرورت کی وجہ سے میں نے) اللہ تعالیٰ کے لیے اس رسالہ کو لکھا ہے،تاکہ مناظرہ وگفتگو کے

وقت، اپنی حد سے باہر نہ ہوں اور اپنے اصول کا
انکار نہ کردیں اور بعض ایسے معاملات میں جو
حقیقی اور صحیح ہیں، شک وتردد کو راہ نہ دیں۔

تحفہ اثنا عشریہ کی تالیف ۱۲۰۴ھ (۹۰-۱۷۸۹ء) میں مکمل ہوئی تھی، لفظ چراغ کے اعداد (۱۲۰۴) سے، اس کا سنہ تالیف معلوم ہوتا ہے۔ چوں کہ اس وقت نظام حکومت پر شیعوں کی پکڑ سخت تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ شیعہ مذہب کے خلاف کوئی کام ہو، اس لیے بھی اور غالباً اس خیال سے بھی کہ یہ کتاب اکثر کتاب پڑھنے والوں تک پہنچے اور خصوصاً شیعہ صاحبان، اس کے مصنف کے نام کی وجہ سے اس کو ہاتھ سے نہ رکھ دیں، مصنف نے اپنا مشہور نام نہیں لکھا، بلکہ تاریخی نام لکھا، اور اپنے والد کی کنیت لکھی، تحریر ہے:

''امابعد می گوید بندہ درگاہ قادرقوی، حافظ غلام حلیم، ابن شیخ قطب الدین
احمد، ابن شیخ ابوالفیض دہلوی''۔(۷۶)

اور اس کے بعد کتاب کے نام میں بھی ایک نکتہ پیدا کرکے، اس کے نام سے پیدا ہونے والے سوال کو ٹال دیا۔ فرماتے ہیں:

''ایں رسالہ را تحفہ اثنا عشریہ نام نہادہ شد،	اس رسالہ کا تحفہ اثنا عشریہ نام رکھا گیا ہے،
زیرا کہ بعد از انقضائے قرن ثانی عشر از	کیونکہ حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی
ہجرت خیر البشر علیہ التحیۃ والسلام، صورۃ	ہجرت کے بارہ سو سال بعد تالیف ہوا اور
تالیف پذیرفتہ وجلوۂ ظہور گرفتہ''۔(۷۷)	سامنے آرہا ہے۔

خطی نسخے: تحفہ اثنا عشریہ کی بھی، تفسیر فتح العزیز کی طرح زمانۂ تالیف میں بہت شہرت ہوگئی تھی اور تصنیف کے دوران ہی لوگوں نے اس کی نقلیں حاصل کرنی شروع کردی تھیں، شاید اسی کا اثر ہے کہ ہندوستان پاکستان کے کتاب خانوں میں، اس کے تقریباً پچاس قلمی نسخے دریافت ہیں، جن نسخوں کا مجھے علم ہے، ان میں اہم ترین نسخہ، قومی عجائب گھر، لاہور کے ذخیرہ میں ہے، مجھے بھی اس کے دیکھنے کا موقع ملا تھا، یہ نسخہ اپنی خصوصیات میں ممتاز ومنفرد ہے۔

یہ نسخہ نسخۂ مصنف کی نقل ہے، ترقیمۂ کاتب میں لکھا ہے:

"نقل از روئے اصل نسخہ، جناب مستطاب، اعلم العلما وافضل الفضلا،
حضرت صاحب وقبلہ، مصنف کتاب، معلّٰی الالقاب، ادام اللہ اجلالہ وافضالہ"

قطعہ تاریخ از حضرت مصنف: اس نسخہ کے آخر میں حضرت مصنف شاہ عبدالعزیز کا اس کتاب کی تکمیل پر لکھا ہوا، قطعہ تاریخ بھی شامل ہے جو یہ ہے:

تحفہ را یک فن مداں کہ درو سوئے ہر معرفت سراغ آمد
سوئے لفظ ومعانیش بنگر ہست دریا کہ در ایاغ آمد
بس کہ نور ہدایت است و یقیں سال تاریخ او چراغ آمد

یہ قطعۂ تاریخ، فخر المطابع، دہلی کے مطبوعہ نسخہ کے آخر میں بھی چھپا ہوا ہے، مگر عموماً دریافت نسخوں میں موجود نہیں۔

نسخۂ لاہور پر متعدد علما کی مہریں اور تصدیقات ثبت ہیں، جو اس طرح ہیں:

۱۔سید محمد ۲۔خادم شرع احمدی ۳۔ایک مہر پر، غالباً محمد تہور خاں بہادر، تحریر ہے
مفتی احمد علی ۴۔سید خوب علی ۱۲۴۲ھ

باقی صاف نہیں ہیں اور لکھا ہے: "بندہ درگاہ خدا محمد بن نور اللہ غفر اللہ لہ"۔

آخر میں کاتب کی مفصل تحریر ہے، جس کی آخری سطور یہ ہیں:

"نقل از روئے اصل نسخہ، جناب مستطاب، اعلم العلما وافضل الفضلا،
حضرت صاحب وقبلہ، مصنف کتاب، معلّٰی الالقاب ادام اللہ اجلالہ وافضالہ۔
قاضی الحاجات، مجیب الدعوات تا قیام قیامت، ایں ذات ستودہ صفات را کہ خیر خواہ خلائق است و کاشف دقائق، بصحت سلامت با کرامت دارد، آمین آمین آمین"۔

ایک اور قدیم قلمی نسخہ: تحفہ اثنا عشریہ کا ایک اور پرانا نسخہ جو تالیف کے بارہ سال بعد ۱۲۱۶ھ/ ۱۸۰۲ء میں نقل ہوا تھا، مدرسہ مظاہر علوم (قدیم) سہارن پور میں موجود ہے، یہ نسخہ برکت اللہ بن درویش محمد کے قلم سے ۱۲۱۶ھ کا لکھا ہوا ہے، اسی سنہ ۱۲۱۶ھ کا مکتوبہ، ایک اور نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے، جو شیخ غلام حسین حیدر آباد کے قلم سے ہے۔(۷۸)

ہمارے ذاتی ذخیرہ میں: ہمارے آبائی کتب خانہ میں تحفہ کا ایک قدیم ترین نسخہ تھا، جو اس کی تصنیف کے مکمل ہونے کے سال ۱۲۰۴ھ/ (۹۰-۱۷۸۹ء) میں نقل کیا گیا تھا، مگر یہ نسخہ اب موجود نہیں، معلوم نہیں کہاں گیا، لیکن ایک اور نسخہ جو موجود ہے، اس کے ترقیمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مصنف کی حیات میں لکھا گیا تھا۔ یہ نسخہ باریک کاغذ پر ستھری تحریر میں نقل ہوا ہے، ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے، کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں، مگر کاتب کے حضرت مصنف کے لیے الفاظ ''أدام الله اجلاله و علمه و إقباله'' سے خیال ہوتا ہے، کہ مصنف کی حیات کا ہے۔

طباعتیں: تحفہ اثنا عشریہ حضرت شاہ صاحب کی پہلی تصنیف ہے، جو شاہ صاحب کی حیات میں چھپی اور تصنیف کے صرف بارہ سال بعد، کلکتہ سے شائع ہوگئی تھی، اس وقت سے اس کی طباعتیں اور ترجموں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ تقریباً ڈیڑھ سو سال تک جاری رہا، تحفہ کی دلی، لکھنؤ، کانپور، کلکتہ وغیرہ کی دسیوں طباعتیں میری نظر سے گذری ہیں، مگر میری ناچیز معلومات میں ان میں اعلیٰ درجہ کی اور مفید ترین طباعت، مطبع فخر المطابع دہلی (۷۹) کی ہے، جو ۱۲۶۹ھ/ (۵۳-۱۸۵۲ء) کی ہے، اس کے حاشیوں پر مصنف کی اطلاعات کے مآخذ کے حوالے اور مزید موید عبارتیں و تصریحات درج ہیں، جو اس کی افادیت کو دو چند کرتی ہیں، لیکن فخر المطابع کے نسخہ کو کسی اور نے بھی چھاپا ہو، اس کا مجھے علم نہیں۔

اردو ترجمے: تحفہ کے اردو میں چار ترجمے شائع ہوئے ہیں۔

ا۔ پہلا ترجمہ تحفۂ حسن از سر سید احمد خاں: سب سے پہلا مگر جزوی ترجمہ، سر سید احمد خاں کی یادگار ہے۔ سر سید احمد نے تحفہ کے دسویں اور بارہویں باب کا اردو ترجمہ، تحفۂ حسن کے نام سے، اپنے استاد اور مربی، مولانا نور الحسن کاندھلوی (وفات: ۱۲۸۵ھ) کی مدد سے کیا تھا اور ان ہی کے نام سے نسبت کرتے ہوئے، اس کا نام تحفۂ حسن رکھا تھا۔ سر سید احمد خاں نے لکھا ہے:

> ''جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز نے، تحفہ اثنا عشریہ لکھا ہے، اس سے بہتر تحفہ کی کوئی کتاب نہیں ہو سکتی اور بن نہیں آتی، اس واسطے میں نے اس کتاب کے دسویں باب سے، مطاعن حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جو خلیفۂ اول ہیں، صاف اردو زبان میں ترجمہ کیا کہ چھوٹے سے بڑے تک اور جاہل سے

عالم تک کو، فائدہ پہنچے اور شیعوں کی اوچھی اوچھی باتیں، سب کو معلوم رہیں اور اس ترجمہ کا نام تحفۂ حسن رکھا"۔(۸۰)

سرسید کی شائع کی ہوئی پہلی طباعت کے علاوہ، تحفۂ حسن کی کسی اور مستقل طباعت کا مجھے علم نہیں، لیکن تحفۂ حسن، تصانیف احمدیہ اور مقالات سرسید میں شامل ہے۔

۲۔معروف ترین ترجمہ، ہدیہ مجیدیہ: تحفہ کے اردو ترجموں میں، سب سے زیادہ اشاعت وشہرت ہدیہ مجیدیہ کی ہوئی، یہ مولوی عبدالمجید خلف عبدالرحیم خاں، پیلی بھیت کی یادگار ہے اور یہ لطف اللہ خاں صاحب کی فرمائش پر ہے۔ یہ ترجمہ ۱۳۰۷ھ میں ہوا اور بار بار شائع ہوتا رہا، پیش نظر اشاعت، مطبع مصطفائی لکھنؤ کی ۱۳۱۱ھ (۹۴۔۱۸۹۳ء) کی ہے، دونوں حصے ایک جلد میں ہیں، حصہ اول ۴۶۸،صفحات پر مشتمل ہے، حصہ دوم کے ۳۲۸،صفحات ہیں۔

۳۔آئینہ مذاہب امامیہ: ایک اور ترجمہ، آئینہ مذاہب امامیہ ہے، جس کو مطبع رفیق عام لاہور سے، الٰہی بخش نے چھپوایا تھا، یہ ترجمہ اگرچہ زبان کے اعتبار سے پہلے ترجمہ سے کچھ بہتر ہے، مگر اس پر مترجم کا نام ہے، نہ سنہ طباعت درج ہے، کل ۵۹۲،صفحات ہیں۔(۸۱)

۴۔چوتھا ترجمہ: ایک اور ترجمہ مولانا سعادت حسن خاں یوسفی کا ہے، جو سب سے پہلے نور محمد کارخانۂ تجارت کتب، کراچی نے شائع کیا تھا۔اس کے عکس ہندوستانی اداروں سے بھی چھپے۔

منہیہ یا تکملہ تحفہ اثناعشریہ: جب تحفہ اثناعشریہ کے نسخے عام ہوئے، تو اس سلسلہ میں بہت سے سوالات بھی شروع ہوئے اور یہ بات سامنے آئی کہ بعض بحثیں تشنۂ تکمیل ہیں، ان پر مزید توجہ کی ضرورت ہے، اس لیے حضرت شاہ صاحب نے اس موضوع پر دوبارہ توجہ فرمائی اور جو مضامین ومباحث ناتمام رہ گئے تھے، ان پر بھی ایک تالیف وجود میں آئی، جس کو منہیہ (یا تکملہ تحفہ اثناعشریہ) کے نام سے موسوم کیا گیا لیکن اس منہیہ یا تکملہ کی ویسی شہرت نہیں ہوئی، جیسی تحفہ اثناعشریہ کی ہوئی تھی، نہ اس کی اس قدر نقلیں کی گئیں اور نہ یہ اس قدر چھپی، یہ منہیہ ایک دو اشاعتوں کے آخر میں شامل ہے اور اس کے خطی نسخے بھی کم دستیاب ہیں۔ایک نسخہ جو خواجہ عبداللہ مخدوم الاعظمی کے قلم سے، ۱۷۰،صفحات پر مشتمل ہے، رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے(۸۲)۔تین نسخے اور بھی معلوم ہیں۔

السر الجليل في مسئلة التفضيل، عزيز الإقتباس في فضائل أخيار الناس

اور **وسیلۃ النجات**، یہ تینوں رسائل بھی تحفہ سے متعلق مباحث پر مشتمل اور گویا تحفہ کا تکملہ ہیں، یہ فتاویٰ عزیزیہ میں چھپے ہیں اور علاحدہ بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

عربی ترجمے: تحفہ اثنا عشریہ طباعت سے پہلے ہی مقبول عام ہوگئی تھی اور پورے ملک میں پڑھی جارہی تھی، جنوب کے لوگوں نے بھی اس سے استفادہ کی ضرورت محسوس کی اور اس سے کامل استفادہ کے لیے اس کا عربی ترجمہ ضروری سمجھا، اس خیال سے جنوب کے دو علماء نے تحفہ کے عربی میں ترجمے کیے۔

پہلا ترجمہ: تحفۂ اثنا عشریہ کا ایک عربی ترجمہ، مولانا غلام محمد، سعید اسلمی مدراسی (وفات: ۱۲۷۲ھ) نے ۱۲۲۷ھ میں کیا تھا، جس کا نام: **الترجمۃ العبقریۃ و الصلوٰۃ الحیدریۃ** ہے۔

اس کا ایک نسخہ جو خط نستعلیق میں ۲۴۶ اوراق پر مشتمل فضل الرحمان ملانوی کے قلم سے ہے، رجب ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) کا لکھا ہوا ٹونک میں ہے۔(۸۳)

مولانا سعید اسلمی کے ترجمہ کے دو خطی نسخے علامۂ عراق شیخ محمود شکری آلوسی کو ملے تھے، انہوں نے ۱۳۰۱ھ میں ان کا مقابلہ کیا اور اس کا ایک عمدہ خلاصہ مرتب فرمایا، علامہ شکری اگرچہ مولانا سعید اسلمی مدراسی ترجمہ کی عجمیت اور کثیر الخطاء ہونے کے شاکی ہیں، پھر بھی انہوں نے اس پر توجہ فرمائی۔ علامہ شکری آلوسی کی کوشش سے یہ نسخہ مطبع مجتبائیہ بمبئی (۸۴) سے ۱۳۱۵ھ میں چھپا تھا، مگر اغلاط سے پُر تھا، دوبارہ علامہ فاضل شیخ محب الدین خطیب نے اس کی تصحیح اور مکمل نظر ثانی فرمائی، یہ کام ۱۳۷۳ھ میں مکمل ہوا تھا۔ یہ نسخہ علامہ محب الدین خطیب کی تصحیح سے قاہرہ کے مکتبہ سلفیہ سے ۱۳۷۳ھ میں چھپا تھا، یہ طباعت ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے، اس طباعت کی نقول (Re-Prints) مختلف اداروں سے شائع ہوئیں، جس میں ترکی کا خیراتی ادارہ حلمی ایشیق، استنبول بھی شامل ہے۔

دوسرا عربی ترجمہ: دوسرا عربی ترجمہ، علامہ شاہ عبداللطیف نقوی ویلوری (قطب ویلور) وفات ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) نے کیا تھا، یہ ترجمہ مکہ مکرمہ کے قیام میں ۶۲-۱۲۶۰ھ کے درمیان کیا گیا۔

۲۔ چند نادر رسائل و مؤلفات کے خطی نسخے

۱۱۔ ردجاہلین: فقہی مسائل اور اعتقادات پر مشتمل، حضرت شاہ صاحب کے ارشادات کا ایک مجموعہ، جو سردار علی کے قلم سے، ذی قعدہ ۱۲۵۹ھ (دسمبر ۱۸۴۳ء) کا مکتوبہ ہے۔ ذخیرۂ پروفیسر حافظ

محمود خاں شیرانی (پنجاب یونیورسٹی) لاہور میں موجود ہے۔ (۸۵)

۱۲۔ مجموعۃ الفتاویٰ، الف: حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسماعیل شہید وغیرہم کے فتاویٰ کا مجموعہ، مکتوبہ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) فارسی میں ٹونک میں ہے۔ (۸۶)

ب: مجموعہ فتاویٰ شاہ عبدالعزیز و مولانا حیدر علی وغیرہ، یہ نسخہ ۱۸۹/ورق پر مشتمل ہے، مکتوبہ ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸ء)، کاتب کا نام درج نہیں۔

ج: ایک نسخہ علی گڈھ میں بھی ہے، خط نستعلیق اور زبان فارسی ہے، ۱۱۵/صفحات پر مشتمل ہے۔ (۸۷)

۱۳۔ کرامات الاولیاء: شاہ عبدالعزیز کے مرید شاہ قادر بخش لاہوری کے قلم سے فارسی میں رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔

۱۴۔ میزان البلاغۃ (عربی): مکتوبہ ۱۲۱۴ھ (۱۸۰۰-۱۷۹۹ء) بقلم حضرت شاہ محمد اسحاق، مولانا زید ابوالحسن دہلی کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے۔

۱۵۔ وسیلۃ النجات: اہل سنت کے عقائد کی حقیقت میں دلائل پر مشتمل رسالہ جو ۲۶/اوراق پر ہے، محمد علی پھلتی کے قلم سے عمدہ تحریر میں ہے، مکتوبہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) آخر میں محمد علی کی مہر ثبت ہے، جس پر ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) کندہ ہے۔

یہ نسخہ ہمارے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ اس کا ایک نسخہ جو غالباً ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) کا مکتوبہ ہے، کتب خانہ مدرسہ محمدیہ جامع مسجد بمبئی میں بھی ہے۔

۱۶۔ رسالہ دررد ّاعتراضات بر کلام مجدد: رضا لائبریری رامپور میں ہے، (۸۸) کل ۱۲/اوراق ہیں۔

۱۷۔ ملفوظات عزیزیہ: رضا لائبریری، رامپور میں ہے۔ (۸۹)

ب: معروف و مطبوعہ مجموعۂ ملفوظات شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ صاحب کے ایک متوسل قاضی بشیر الدین احمد میرٹھی کے دادا صاحب کا مولفہ و مرتبہ ہے، جو ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں قلم بند کیا گیا تھا۔ اس کا ایک خطی نسخہ اٹاوہ میوزیم میں تھا (۹۰)۔ اٹاوہ میوزیم کے سرمایہ کے ساتھ یہ نسخہ بھی مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ منتقل ہو گیا تھا، تفصیلات اپنے موقع پر آ رہی ہیں۔

۱۸۔ رسالہ فی شرح قول الشیخ الرئیس: شیخ قادر بخش کے قلم سے رضا لائبریری، رامپور میں

ہے۔(۹۱)

۱۹۔رسالہ تحفۃ المسلمین: ۱۲۷۰ھ(۵۴-۱۸۵۳ء) کا مکتوبہ، مناظرہ کے موضوع پر صولت پبلک لائبریری رامپور میں ہے۔

۲۰۔رسالہ فی ردالرسالۃ فی کلمات التوحید: شیخ عبدالرحمان موحد لکھنوی کے رسالہ کی تردید عربی میں ہے، مولانا عبدالحی حسنی نے اس کا نزہۃ الخواطر میں تذکرہ کیا ہے(۹۲)، اس کا ایک نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔

۲۱۔الروضۃ الأنیقۃ في بیان الشریعۃ و الحقیقۃ: خدابخش لائبریری پٹنہ میں ہے۔

۲۲۔رسالہ حلت: آصفیہ لائبریری میں ہے۔ایک نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں بھی ہے۔

۲۳۔رسالہ ارکان حج (مترجم): نہایت خوشخط نسخہ ہے، فی صفحہ دس سطور ہیں، کل ۳۴۳ر اوراق پر مشتمل ہے، بھوپال کی سنٹرل لائبریری میں ہے۔

بیگم بھوپال نے اردو میں اس کا ترجمہ مولانا شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی سے کرایا تھا، جس کا نام ارکان حج ہے، یہ ترجمہ مطبع سکندری بھوپال سے ۱۲۷۸ھ(۱۸۶۲ء) میں چھپا تھا۔(۹۳)

۲۴۔مجموعۂ فتاویٰ: اس میں حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور مولانا عبدالحی کے فتاویٰ ہیں، جامعہ ہمدرد دہلی کی لائبریری میں ہے۔

۲۵۔ذکر حملۃ العرش: عربی میں ہے، شائع بھی ہوچکا ہے، خطی نسخہ، مظاہر علوم (قدیم) سہارنپور میں ہے۔

۲۶۔بیاض حضرت شاہ عبدالعزیز: بھوپال کے قیام کے زمانہ میں مولانا عبدالقیوم بڈھانوی کے ذخیرہ میں تھی، جو مولانا محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری نے دیکھی تھی(۹۴)۔ایک اور بیاض جو شیخ احمد ابوالخیر مکی نے پھلت (مظفرنگر) میں دیکھی تھی، اب دونوں کا کچھ پتہ نشان موجود نہیں۔

۲۷۔رقعات عزیزی: شاہ صاحب کے فارسی مکتوبات کا مجموعہ ہے، راقم سطور نے مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد، مظفرنگر یوپی کے کتب خانہ میں دیکھا تھا۔

۲۸۔سنگیت شاستر: موسیقی کے موضوع پر، کندن لال اشکی کے قلم سے، رضا لائبریری میں محفوظ ہے، شائع بھی ہوچکی ہے۔(۹۵)

۲۹۔ رسالہ فی العقاید: صرف دو ورق ہیں، خطی نسخہ ٹونک میں محفوظ ہے(۹۶) شائع ہو چکا ہے۔

۳۰۔ جوابات سوالات عشرہ شاہ بخارا۔(۹۷)

۳۱۔ اجوبہ و تحقیق رسائل متعددہ: مکتوبہ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) ۲۶/اوراق پر مشتمل ہے(۹۸)، ٹونک میں ہے۔

۳۲۔ شرح بدیع المیزان (رسالہ نفائس ارتضائیہ): عبدالقادر آتوری کے قلم سے ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۷ء) کا مکتوبہ ہے۔

اس کے ایک نسخہ کا مولانا ڈاکٹر راہی فدائی صاحب بنگلور نے اپنے مضمون میں تذکرہ کیا ہے، ایک اور نسخہ راقم کے مرحوم دوست مولانا حبیب اللہ قربان چمپارنی، دفین مدینہ طیبہ نے دہلی کے کتب خانہ انجمن ترقی دہلی سے خریدا تھا، یہ نسخہ بھی مولانا عبدالقادر آتوری کے قلم سے ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۷ء) کا لکھا ہوا تھا، یہ نسخہ مولانا حبیب اللہ کے ذاتی ذخیرہ میں موجود ہوگا۔

۳۳۔ رسالہ تحکیم: کتب خانہ مدرسہ محمدیہ جامع مسجد، بمبئی میں ہے۔

۳۴۔ رسالہ عقائد: عقیدہ کے موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیف حسن العقیدہ کے طرز پر مختصر مگر جامع رسالہ ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز کی بھی اسی طرح کی ایک مختصر مگر جامع تالیف ہے، یہ رسالہ نسبتاً گمنام رہا، اگرچہ عقائد کی بڑی فنی اصولی کتابوں کے ساتھ شامل ہو کر تین چار مرتبہ چھپا بھی ہے، مگر اس کا عموماً تذکرہ نہیں ملتا۔

۳۔ سلوک و تصوف، منطق و فلسفہ اور نحو و صرف وغیرہ کی درسی کتابوں پر حاشیے

۳۵۔ حاشیہ بر میر زاہد (عربی): مدرسہ مظاہر علوم (قدیم) سہارن پور میں ہے۔ اس کا ایک اور نسخہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں ذخیرۂ فرنگی محل میں ہے۔

۳۶۔ حاشیہ میر زاہد بر امور عامہ (عربی): مدرسہ مظاہر علوم (قدیم) سہارن پور میں ہے۔

۳۷۔ حاشیہ بر میر زاہد ملا جلال: مدرسہ مظاہر علوم (قدیم) سہارن پور میں ہے، امام الدین کے قلم سے مکتوبہ ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔

۳۸۔ حاشیہ کافیہ (عربی): جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کی لائبریری میں ہے۔

۳۹۔ حاشیہ صدرا: ذخیرۂ فرنگی محل، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ہے۔ ۸۰/صفحات پر مشتمل

ہے۔رضالائبریری رام پور میں بھی ایک نسخہ ہے۔

۴۰۔الحاشیة علی القول الجمیل:　　　عربی میں خدابخش لائبریری پٹنہ میں ہے، رضا لائبریری،رام پور میں بھی ایک نسخہ ہے۔

۴۔دو نادرترین تالیفات جو ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہیں

حضرت شاہ عبدالعزیز کی ایسی متعدد تصانیف ورسائل ہیں،جن کا تعارف نہیں اور وہ عموماً دریافت ودستیاب بھی نہیں۔ایسی ہی دو تالیفات کے خطی نسخے ہمارے ذخیرہ میں ہیں:

۴۱۔حاشیة المقدمة السنیة:　　　اول حاشیہ المقدمة السنیة، یہ شیعیت کی تردید میں حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک مختصر مگر جامع تالیف ہے،اس کے خطی نسخے بھی کم یاب تھے،مولانا زید ابوالحسن فاروقی دہلوی نے ہمارے ذخیرہ کے خطی نسخے اوران کے علاوہ دو تین نسخوں کی مدد سے اس کو مرتب کرکے دہلی سے شائع کردیا تھا،یہی اس کی واحد اشاعت ہے،جس کے عکس (Re-Print) پاکستان میں چھپے ہیں۔

المقدمة السنیة پر شاہ عبدالعزیز نے عربی میں مفصل حاشیہ لکھا تھا،جو نہایت کم یاب ہے،اس کا ایک اچھا نسخہ جو غالباً روح اللہ کشمیری شاگرد مرزا حسن علی محدث لکھنوی کے قلم سے ہے (۹۹)،ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

حاشیہ المقدمة السنیة ۱۰/اوراق یا ۲۰/صفحات پر مشتمل ہے،فی صفحہ ۱۸/سطور ہیں، تحریر عمدہ وصاف ہے،آخر میں سنہ کتابت ۱۲۵۷ھ(۱۸۴۱ء)درج ہے اور لکھا ہے:

"تمت الحاشية المؤلفة على المقدمة السنية في الانتصار لمذهب السنية، من تصانيف أفضل العلماء، رئيس الفضلاء، حبر المدقق، نحرير المحقق مولانا ومرشدنا، شاه عبد العزيز دهلوى قدس سره العزيز، بتاریخ بست وپنجم شہر ربیع الاول ۱۲۵۷ھ(۱۸۴۱ء)"۔

۴۲۔رسالہ مناظرہ شیعہ وسنی بحضور حضرت شاہ عبدالعزیز:　　　ہمارے ذخیرہ کی ایک اور نادر یادگار،ایک مناظرہ کی روداد ہے،جو ۵/محرم جمعہ کے دن،حضرت شاہ عبدالعزیز کے سامنے منعقد ہوا تھا۔(مناظرہ کا سنہ تحریر نہیں)

یہ نسخہ بھی روح اللہ کشمیری کے قلم سے ہے، ان کے نقل کیے ہوئے رسائل میں شامل ہے، افسوس کہ یہ نسخہ ناقص و ناتمام ہے، اس کے صرف ۲/ ورق محفوظ رہ گئے ہیں، جس کے آغاز میں لکھا ہے:

''ایں کتاب است مسمی بانصاف فی رفع الاختلاف، روز جمعہ پنجم محرم الحرام،

مجلس مناظرہ بحضور شاہ صاحب منعقد گشت''۔

ایک اہم ترین مجموعۂ رسائل: حضرت شاہ عبدالعزیز کے رسائل کا ایک بہت قیمتی اور اس وقت تک معلوم جامع ترین اور اہم مجموعہ، رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے، اس میں حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کے ۱۱۲/ رسائل ہیں، ان میں سے ۷۸/ رسائل حضرت شاہ عبدالعزیز کے اور ۳۴/ شاہ رفیع الدین کے ہیں۔ دو تین رسائل اور بھی شامل ہیں، مگر میرے خیال میں ان کی شاہ صاحب سے نسبت مشتبہ ہے۔

اس مجموعہ پر کاتب کا نام اور تاریخ تحریر درج نہیں، مگر اس کے بعد جو چند اور صفحات ملحق ہیں، ان پر سن کتابت ۱۲۹۵ھ تحریر ہے، لیکن وہ بالکل علاحدہ تحریر کاتب ہے، اصل مجموعہ سے ان کا قلم اور تحریر بہت مختلف ہے۔

اس مجموعہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز سے منسوب رسائل کے نام، یہاں درج کئے جاتے ہیں(۱۰۰)، جس سے اس مجموعہ کی اہمیت اور وسعت کا اندازہ ہوگا۔(۱۰۱)

ان میں سے چند رسائل کا تعارف مجموعۂ فتاویٰ کے تحت گزر گیا ہے اور چند رسائل کے متفرق علاحدہ نسخے مختلف کتاب خانوں میں موجود ہیں، ان سب کا آیندہ صفحات میں تذکرہ آرہا ہے، مگر یہ تذکرہ اور اندراج پہلے ہو چکا تھا، نسخہ رضا رام پور بعد میں نظر سے گذرا، اس لیے چند رسائل کا اندراج مکرر ہو گیا ہے۔

۱۔ جوابا علی أسئلة متعلقه بزيارة القبور والتعزية وغيرها للشاه عبد العزيز، ۲۔ تقرير صدر الدين، على إختلاف أدلة المجتهدين، ۳۔ تقریر مسئلہ وحدۃ الوجود والشہود، ۴۔ اعتراض بر مولانا شاہ عبدالعزیز، ۵۔ تقریر جواب شاہ عبدالعزیز، ۶۔ جواب از مولانا عبدالعزیز در بارہ گرفتن اجرت برخواندن الخ، ۷۔ تفسیر آیت کریمہ و ما أهل به لغير الله از شاہ صاحب، ۸۔ ماخذ تالیف تحفہ اثنا عشریہ، ۹۔ مسئلہ تفضیل علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ، ۱۰۔ قواعد مذہب حنفیہ،

۱۱۔تعداد احادیث البخاری، ۱۲۔تعداد مرویات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہم، ۱۳۔رسالہ در علم معانی وبیان وبدیع، ۱۴۔حواشی بدیع المیزان در منطق، ۱۵۔حواشی شرح عقائد، ۱۶۔رسالہ در منطق، ۱۷۔ردرسالہ مولوی عبدالرحمان صوفی للشاہ عبدالعزیز، ۱۸۔جواب متعلق بدار الحرب والاسلام وتحقیق ذلک ، ۱۹۔جواب فی حق سید مبتدع، مجاهر بالفسق، ۲۰۔جواب متعلق بقصة فدک الخ،۲۱۔مسئله فی تکفیر منکر ضروریات الدین، ۲۲۔مسئله فی تحقیق اجتهاده صلی اللّٰہ علیه وسلم ، ۲۳۔مسئله فی تکفیر الخوارج، ۲۴۔في تحقيق خلافة الصديق رضی اللہ عنہ وغيرها، ۲۵۔في تحقيق ما أهل به لغير الله ،۲۶۔جواب في تحقيق حديث، ستفترق أمتي الخ، ۲۷۔في حل الربوا فی دارالحرب، ۲۸۔ جواب في جواز تفريق الشفعة، ۲۹۔فی تحقیق لفظ وإن كان، ۳۰۔فی معنی حدیث، رجعنا من الحج الأصغر الخ، ۳۱۔ تحقيق مسئلة وحدة الوجود، ۳۲۔در بیان ادلہ ثبوت ولایت ما در وپدر دختر صغیرہ، ۳۳۔حکم نکاح دختر با غیر کفو، ۳۴۔جواب در تحقیق......داماد ے وعدم اعتبار شرط آں، ۳۵۔در بیان گردش فلک واحوال قطب، ۳۶۔تاویل قصیدہ بانت سعاد، ۳۷۔در بیان احوال ہنڈوی، ۳۸۔در بیان بودن اقلیم ہندوستان دارالحرب، ۳۹۔اختلاف شیعہ، ۴۰۔در بیان عدم اعتبار دست آویز الخ، ۴۱۔الصک ليس بحجة، ۴۲۔عدم کفایت قرآن برائے ہدایت الخ، ۴۳۔در بیان اعجاز قرآن بر تمام امت، ۴۴۔بیان اوتار ہنود الخ، ۴۵۔در بیان استمداد از اہل قبور الخ، ۴۶۔جواب در تحقیق مرد صالح الخ، ۴۷۔درتحقیق معنی لا أراكم فاعلين، ۴۸۔وراثت دراوقاف الخ، ۴۹۔فی بيان آية التخيير وسبب نزولها، ۵۰۔فی جواز الانتفاع بالمرهون وإباحته، ۵۱۔جواب فی منع المزامير وغيرها على القبور، ۵۲۔فی بیان تحقيق منع الغلام، ۵۳۔فی بیان حرمة الذبح بأسماء الأولياء وغيرهم، ۵۴۔فی بیان بيع الإنسان بثلاثة أطوار، ۵۵۔فی بیان الطلاق فی حالة الغضب، ۵۶۔در بیان اقسام بیع بردہ وجواز منع آں، ۵۷۔فی بیان معنی حدیث، أين كان إبنا الخ، ۵۸۔درتحقیق تکفیر وعدم تکفیر اهل قبله الخ، ۵۹۔فی تحقيق حال معاوية رضی الله عنه وغيره، ۶۰۔در شمار آیات وحدانیت باری تعالیٰ،

۶۱۔ در تحقیق زمین مملوکہ بیت المال الخ، ۶۲۔ فی مدة خلافة بنی أمیة، ۶۳۔ در حکم گاؤ کہ بنام خدا ذبح کردہ شد، ۶۴۔ در ذکر معراج آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم و بیان روایات الخ، ۶۵۔ خط در بیان توحید وجودی و توحید شہودی، ۶۶۔ خط بنام حافظ مصری، بہ مقدمۃ الخ، ۶۷۔ مکتوب بنام مولوی نور محمد الخ، ۶۸۔ سوال متعلق بیان تفضیل میان اولادِ شیخین الخ، ۶۹۔ جواب در تحقیق تفضیل نوعے و شخصے الخ، ۷۰۔ سوالات عشرہ مرزا جان، ۷۱۔ تقریر مسئلہ وحدت وجود الخ، ۷۲۔ مسئلہ تقلید، ۷۳۔ بحث در ترک رفع الیدین الخ، ۷۴۔ مراد از دوازدہ خلیفہ الخ، ۷۵۔ تاویل بعض معارف مجدد الف ثانی قدس سرہ، ۷۶۔ حل موضع از قانون شیخ الرئیس متعلق طب، ۷۷۔ بیان تفضیل حضرت (علیؓ) مرتضی، ۷۸۔ شرح غایة الرفع فی ذروة الوضع۔

۵۔ ہمارے ذاتی ذخیرہ میں موجود حضرت شاہ صاحب کی چند اور تصانیف

۴۳۔ رسالہ اسرار الشہادۃ: ۱۲ر صفحہ کا رسالہ ہے، فی صفحہ عموماً ۱۵ر سطریں ہیں (۱۰۲)، مکتوبہ مولانا نور الحسن کاندھلوی ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء)۔

۴۴۔ سوالات ستہ و جوابات: ۱۸ر صفحے کا رسالہ ہے، فی صفحہ ۱۵ر سطور ہیں، مکتوبہ بقلم مولانا نور الحسن کاندھلوی ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء)۔

۴۵۔ رسالہ سوالات متفرقہ: شاہ عبد العزیز سے کیے گئے دس سوالات کے جوابات کا مجموعہ، ۸ر اوراق پر مشتمل ہے، کاتب کا نام محمد یعقوب پھلتی درج ہے، سنہ کتابت تحریر نہیں۔

۴۶۔ رسالہ شاہ عبد العزیز: حضرت حسینؓ اور اہل بیت کرامؓ سے متعلق سوال کا مفصل جواب، صرف ۴ر ورق ہیں، کاتب کا نام نہیں لکھا ہے۔ (۱۰۳)

۴۷۔ خطبہ جمعہ: مولفہ حضرت شاہ عبد العزیز۔ میاں حمایت علی پھلتی کے قلم سے اس کی نقل غلام مصطفیٰ پھلاؤدہ نے ۱۲۶۵ھ میں کی تھی۔ اس کا ایک نسخہ ہمارے ذاتی ذخیرہ میں ہے۔

یہ وہی خطبہ ہے، جو حضرت شاہ ولی اللہ کے نام سے معروف ہے اور جمعہ کے دن عموماً پڑھا جاتا ہے، یہ خطبہ در حقیقت حضرت شاہ ولی اللہ کا ہے اور التفہیمات الالٰہیہ میں شامل ہے، مگر ہمارے ذخیرہ میں موجود خطی نسخہ، حضرت شاہ عبد العزیز کی خدمت میں حاضر رہنے والے میاں حمایت علی پھلتی صاحب کے نسخہ کی نقل ہے، اس کے حضرت شاہ عبد العزیز سے انتساب میں غالباً میاں حمایت علی

کو سہو ہوا۔

۶۔ حضرت شاہ صاحب کے مطبوعہ چند رسائل

۴۸۔ حاشیة بدیع المیزان (عربی): اس پر عربی میں مولانا محمد نظام الدین کیرانوی کا مفصل عمدہ حاشیہ چھپا ہے، ۸۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبع مجتبائی، دہلی، شوال ۱۲۳۹ھ۔

۴۹۔ حاشیة میزان البلاغة (عربی): مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند) کا مفصل عمدہ حاشیہ ہے، یہ طباعت ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس کا عکس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے صفر ۱۴۱۳ھ (اگست ۱۹۹۲ء) میں شائع کیا تھا۔

۵۰۔ السر الجلیل في مسئلة التفضیل: تحفہ اثنا عشریہ کے متعلقات میں سے اور گویا اس کا ایک ضمیمہ ہے، جو عربی میں ہے، یہ رسالہ علاحدہ بھی کثرت سے نقل و شائع ہوا ہے اور فتاویٰ عزیزیہ میں بھی شامل ہے، السر الجلیل کا پہلا فارسی ترجمہ مولانا مرزا حسن علی محدث لکھنوی نے کیا تھا، اس کے بھی چند خطی نسخے معلوم ہیں۔

الف: السر الجلیل کا پہلا اردو ترجمہ مطبع احمدی دہلی کے سید احمد ولی اللّٰہی کی فرمائش پر مولانا نظام الدین کیرانوی نے کیا تھا، جو مطبع احمدی دہلی سے چھپا تھا۔

ب: السر الجلیل کا ایک خطی نسخہ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے کتب خانہ سے ملا تھا، جس کو مفتی صاحب نے اردو ترجمہ کے ساتھ اپنے مکتبہ دارالاشاعت دیوبند سے شائع کر دیا تھا، یہ ترجمہ ڈاکٹر ایوب قادری کے مرتبہ مجموعہ رسائل شاہ عبدالعزیز میں جو فضائل صحابہ اور اہل بیت کے نام سے کراچی سے ۱۹۶۵ء (شعبان ۱۳۸۴ھ) میں شائع ہوا تھا، شامل ہے۔

۵۱۔ الفضل الجزیل (ترجمہ السر الجلیل في مسئلة التفضیل): اس کا مولانا عبداللطیف سونی پتی نے اردو ترجمہ کیا تھا، فارسی متن اور اردو ترجمہ دونوں مطبوعہ انصاری برقی پریس، دہلی سے ۱۳۵۸ھ (۴۰-۱۹۳۹ء) میں شائع ہوئے تھے۔

السر الجلیل، عزیز الاقتباس اور وسیلة النجات، تینوں رسائل کو ایوب قادری نے اردو ترجمہ اور مفصل مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے کراچی سے فضائل صحابہ و اہل بیت (رضی اللّٰہ عنہم) کے نام سے جنوری ۱۹۶۵ء (شعبان ۱۳۸۴ھ) میں شائع کیا تھا، اس کا مقدمہ شمالی ہندوستان میں شیعیت کے

فروغ، بلکہ تسلط کی تاریخ پر ایک اچھا مطالعہ ہے، جس کو دوبارہ شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

۵۲۔عزیز الاقتباس في فضائل اخیار الناس: اصل کتاب عربی میں ہے، فارسی ترجمہ مولانا مرزا حسن علی محدث لکھنوی کا ہے، جس کو سید احمد ولی اللّٰہی نے مطبع احمدی، دہلی سے ۱۳۲۱ھ (۴-۱۹۰۳ء) میں شائع کیا تھا، اس کے ساتھ مولانا نظام الدین کیرانوی کا اردو ترجمہ بھی ہے، ۲۷۲ رصفحات پر مشتمل ہے، اس کے بعد بھی ہند، پاکستان میں شائع ہوتا رہا۔

۵۳۔فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود: وحدۃ الوجود کی بحث پر شاہ صاحب کی تحریر ہے، جس کو سب سے پہلے سید احمد ولی اللّٰہی نے مطبع احمدی دہلی سے شائع کیا تھا، بعد میں کئی مرتبہ اس کی اشاعت ہوئی، اردو ترجمہ مولانا مشتاق احمد انبیٹھوی کا ہے۔

۵۴۔افضلیت شیخین (اردو ترجمہ وسیلۃ النجات): یہ ترجمہ مولانا محمد سلیمان انصاری کا ہے، جو مکتبہ سلفیہ لاہور نے شوال ۱۳۸۴ھ (مارچ ۱۹۶۵ء) میں شائع کیا تھا۔ اس کی دوسری طباعت ۹-۱۴۰۸ھ (۱۹۸۸ء) کی مکتبہ رحمانیہ لاہور کی ہے، جو ۶۳ رصفحات پر مشتمل ہے۔

۵۴ر ب۔ احسن الحسنات: یہ بھی وسیلۃ النجات کا ترجمہ ہے، جو مولانا عبدالحلیم نگرامی نے کیا تھا، مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۱۵ھ میں شائع ہوا۔

۵۵۔تحقیق الرؤیا (عربی): شاہ صاحب کی عربی تالیف ہے، اردو ترجمہ کے ساتھ پہلی مرتبہ ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوئی تھی، الرحیم اکیڈمی کراچی نے اس کا عکس شوال ۱۴۰۶ھ (جولائی ۱۹۸۶ء) میں شائع کیا تھا، مترجم کا نام درج نہیں۔

۵۶۔سر الشہادتین: حضرت شاہ صاحب کا یہ رسالہ مطبع مصطفائی کانپور سے ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) میں شائع ہوا تھا، اس طباعت میں مولانا خرم بلہوری کا اردو ترجمہ اور مولوی سلامت اللہ کانپوری کے حاشیے شامل ہیں، ضمیمہ کے طور پر اس میں، رسالہ سوالات متعلقہ حضرت حسینؓ (۱۰۴) بھی شامل ہے۔

۵۷۔تقریر دلپذیر فی شرح عدیم النظیر: فارسی میں ہے، قاضی فہیم الدین میرٹھی نے مولوی ہدایت علی کے تعاون سے ترجمہ کیا جس کو اسی نام سے مطبع نامی افضل المطابع مرادآباد نے شائع کیا تھا۔ بعض اصحاب کو مغالطہ ہوا کہ یہ تالیف امکان و امتناع نظیر کی بحث پر ہے، مگر ایسا نہیں ہے، اس

کا موضوع اسلام کے فرائض خمسہ ہیں، مترجم مولانا فہیم الدین میرٹھی کو اس کا خطی نسخہ لکھنؤ سے ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں ملا تھا۔

۵۸۔ رسالہ فیض عام: مصطفائی کانپور ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) سے پہلی بار شائع ہوا تھا، اس کے بعد بار بار شائع ہوا، فتاویٰ عزیزیہ میں بھی شامل ہے۔

۵۹۔ صراط مستقیم: مظاہر علوم (قدیم) سہارن پور میں ہے۔

شاہ صاحب کی اکثر تالیفات و مصنفات کے نسخے ذاتی ذخیروں اور مختلف غیر معروف کتاب خانوں اور لائبریریوں میں بکھرے ہوئے ہیں، ظاہر ہے مجھ ناچیز کی جو ایک بہت چھوٹی سی جگہ میں بیٹھ کر یہ تحریر سپرد قلم کر رہا ہے، وہاں تک رسائی نہیں ہے، اس لیے دوبارہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس میں شاہ صاحب کی جملہ تصانیف و رسائل کا تذکرہ نہیں، جو معلوم ہیں، صرف ان کی بات ہے، مزید مصنفات و رسائل کا کتب خانوں کے وسیع جائزہ سے علم ہوسکتا ہے۔

فقہ اہل ظواہر: حضرت شاہ عبدالعزیز کی مصنفات کی زیر نظر فہرست کے صفحات مکمل ہو کر کمپوز ہو چکے تھے کہ شاہ صاحب سے منسوب اس کتاب کے قلمی نسخہ کا علم ہوا، اس کا تذکرہ اب تک کہیں نہیں آیا۔ اس کا نام فقہ اہل ظواہر ہے، اس کا ایک ہی نسخہ معلوم ہے، جو قاضی احمد شاہ صاحب (قاضیٔ شہر مراد آباد و رام پور) کے ذاتی ذخیرہ میں ہے۔ (۱۰۵)

ملفوظات: شاہ صاحب کی ہر اک محفل، ہر اک نشست علمی افادات سے پُر ہوتی تھی، اس میں حاضر اصحاب اپنے اپنے ذوق کے مطابق، ان باتوں سے فائدہ اٹھاتے اور ان کو اپنی لیاقت و صلاحیت کے مطابق لکھنے اور یاد رکھنے کی بھی کوشش کرتے تھے، اس کا اندازہ ان تصانیف سے ہوتا ہے، جو شاہ صاحب کے شاگردوں اور متوسلین نے تحریر و تالیف فرمائی ہیں، ایسی کتابوں میں درج شاہ صاحب کے افادات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے شاگرد اور مستفیدین شاہ صاحب کے بعض ارشادات کو غالباً اسی وقت لکھ لیتے تھے اور بعد میں اپنی مولفات میں محفوظ فرماتے تھے، مگر افسوس ہے کہ شاہ صاحب کے ارشادات و ملفوظات کا کوئی بڑا مجموعہ ہم تک نہیں پہنچا، صرف ایک مجموعۂ ملفوظات معلوم ہے جو شاہ صاحب کے کسی متوسل نے مرتب و قلم بند کیا تھا۔ اس کے مرتب کون تھے صحیح معلوم نہیں، لیکن قاضی بشیر الدین احمد صاحب قاضی شہر میرٹھ (والد محترم مولانا قاضی زین العابدین سجاد

میرٹھی، وفات ۱۹۹۱ء) کی اطلاع ہے کہ یہ مجموعۂ ملفوظات ان کے دادا کا مرتبہ ہے۔اس مجموعۂ ملفوظات کی ترتیب، جیسا کہ خود مرتب نے لکھا ہے، رجب ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں شروع ہوگئی، منشی نعیم الدین خاں، شیخ لطف علی اور شیخ مبارک اللہ وغیرہ کی فرمائش تھی، مرتب نے جو کچھ سنا، سمجھا اس کو قلم بند کرنے کا اہتمام کیا، مرتب ملفوظات کی موجودگی اور ترتیب ملفوظات کے دوران ہی حضرت شاہ رفیع الدین کی وفات کا سانحہ پیش آیا تھا، ملفوظات میں اس کا تذکرہ ہے اور بھی اس کے کئی مندرجات ایسے ہیں، جو اس کے حقیقی ہونے کی شہادت دے رہے ہیں۔

مگر اس مجموعۂ ملفوظات کے قلمی نسخے بہت کم دستیاب ہیں، اس کا سب سے پرانا نسخہ، جس کا مجھے علم ہے، جواہر میوزیم اٹاوہ میں تھا، جواہر میوزیم کی فہرست میں لکھا ہے کہ یہ مجموعۂ ملفوظات ۱۲۹۴ھ کا مکتوبہ اور چھوٹی ناپ کے ۱۷۵/ اوراق پر مشتمل ہے، خط معمولی نستعلیق ہے، خصوصاً خط نسخ بہت خراب ہے، جس سے عربی عبارتیں بہت غلط ہوگئی ہیں۔(۱۰۶)

طباعتیں اور ترجمے: ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز کا فارسی متن پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی میرٹھ سے قاضی بشیرالدین کے اہتمام سے ذی قعدہ ۱۳۱۴ھ (مئی ۱۸۹۶ء) میں چھپا تھا، یہ نسخہ ۱۲۰/ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے اردو میں چار ترجمے ہوئے ہیں۔

پہلا ترجمہ: فارسی متن کی طباعت کے صرف دو سال بعد اسی ادارہ نے شائع کیا تھا، جس نے فارسی متن میں شائع کیا، یہ ترجمہ مولوی عظمت الٰہی بن مولوی محمد ہاشم (مالک مطبع ہاشمی میرٹھ) نے کیا تھا اور ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے چھپا تھا۔

ملفوظات کا دوسرا ترجمہ: جو شاہ صاحب کے احوال پر مشتمل کمالات عزیزی اور شاہ صاحب سے منسوب عملیات وغیرہ کا جامع ہے، تذکرۂ عزیزیہ کے نام سے قاضی بشیرالدین میرٹھ نے مرتب کیا، جو مجتبائی پریس میرٹھ سے ۱۹۳۴ء (۵۳-۱۳۵۲ھ) میں چھپا تھا، یہ مجموعہ چھوٹی پیمائش کے ۱۲۰/صفحات پر مشتمل ہے، جس میں (ص ۵۰ سے ص ۹۰) تک ملفوظات کا ترجمہ بھی ہے۔

ترجمہ ملفوظات، مطبوعہ کراچی: ملفوظات کا ایک اور اردو ترجمہ ۱۹۶۰ء (۸۰-۱۳۷۹ھ) میں پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز کراچی کے اہتمام سے شائع ہوا تھا، جس پر مترجمین کے دو نام درج ہیں، محمد علی لطفی اور مفتی انتظام اللہ شہابی۔ یہ ترجمہ جو اگرچہ بڑے بڑے دعوؤں کے ساتھ چھاپا گیا تھا اور اس

پر ایک بڑی علمی شخصیت نے پیش لفظ بھی لکھا ہے، مگر افسوس کہ اس کو ترجمہ کہنا ہی غلط ہے، کم ترجمے ہوں گے جس میں اصل کتاب یا متن کو اس طرح نظرانداز کیا گیا ہو کہ ایک آسمان کی کہتا ہے تو دوسرا زمین کی خبر لاتا ہے۔ اس ترجمہ پر مولانا مفتی نسیم احمد امروہوی اور نامور محقق جناب رشید حسن خاں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے بعد اس پر کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں، افسوس کہ ہمارے یہاں بہت سی کتابوں میں اس کے حوالے دیے جاتے ہیں اور اس کو معتبر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ بڑی پیمائش کے ۲۶۰ رصفحات پر مشتمل ہے۔

چوتھا ترجمہ: جس کو جزوی ترجمہ کہنا چاہیے، مولانا نسیم احمد فریدی کی تالیف ''تذکرہ حضرت شاہ عبدالعزیز'' میں شامل ہے۔

عربی مجموعۂ کلام یا دیوان: شاہ صاحب کو زبان و بیان اور شعر و ادب پر جو قدرت تھی، وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ شاہ صاحب زبان کی واقفیت میں نہ صرف اپنے عہد، بلکہ بڑے بڑے لوگوں سے فائق اور شعر و ادب میں فرد فرید تھے، شاہ صاحب کا اردو میں نثر، تحریر یا شعر کا کوئی نمونہ دریافت نہیں مگر عربی فارسی دونوں زبانوں میں شاہ صاحب کے کمال کا علم بہت بلندیوں پر لہراتا تھا، شاہ صاحب کا فارسی یا عربی مجموعۂ کلام مرتب ہوا ہو، مجھے معلوم نہیں، اگرچہ کریم الدین پانی پتی نے لکھا ہے کہ:

> ''ایک دیوان عربی اس فاضل کا موجود ہے، اکثر لوگوں کے پاس شاہ جہاں آباد میں ہے''۔

لیکن اس دیوان یا مجموعۂ کلام کا کریم الدین کے علاوہ کوئی تذکرہ نہیں کرتا، کریم الدین کے معاصرین، ان سے پہلے اور بعد کے کسی ایک شخص نے بھی اس دیوان کی موجودگی کا تذکرہ نہیں کیا، اس کے دیکھنے کی بات بھی کہیں نہیں آئی۔ غالباً کریم الدین کو اس میں مغالطہ ہوا، ہوسکتا ہے ان کے ذہن میں کسی اور کا دیوان ہو، دیوان کی ترتیب اور اس کی موجودگی کی کوئی اطلاع مجھے نہیں ملی۔

دیوان یا مجموعۂ کلام عربی، جمع و ترتیب راقم سطور: اگرچہ شاہ صاحب کے مرتب مجموعۂ کلام کی موجودگی کی کوئی معتبر اطلاع نہیں، لیکن شاہ صاحب کا کلام مختلف بیاضوں اور تحریرات میں بکھرا ہوا موجود تھا، ضرورت تھی کہ اس کو مرتب کیا جائے، اس لیے شاہ صاحب کا جو کلام میرے علم میں تھا،

میں نے اس کو مختلف بیاضوں اور تحریروں سے یکجا مرتب اور جمع کرایا ہے، جس میں شاہ صاحب کے تقریباً ۵۰۰؍اشعار، قصائد وغیرہ آ گئے ہیں، بلاشبہہ یہ عربی شاعری وکلام کا بلند ترین مجموعہ ہے، انشاءاللہ شائع ہوگا تو اس سے شاہ صاحب کی زبان وادب پر نظر کا اندازہ ہوگا۔

مجموعہ مکتوبات ترتیب حسب مشورہ راقم سطور: شاہ صاحب کے مکتوبات بھی عربی زبان و ادب کا ایک گراں قدر سرمایہ ہیں، مگر اس کا باقاعدہ مجموعہ میرے علم میں نہیں، اسی خیال سے راقم نے شاہ صاحب کے وہ عربی مکتوبات بھی مرتب اور جمع کرا لیے ہیں، جو مختلف بیاضوں، قلمی تحریروں اور نادر ترین مطبوعات میں بکھرے ہوئے تھے، اس مجموعہ میں شاہ صاحب کے عربی کے تقریباً سو گرامی نامے آ گئے ہیں۔

یہ دونوں کام مولانا ہدایت اللہ آسامی نے میری ترتیب ومشورہ کے مطابق کیے ہیں، جو امید ہے انشاءاللہ جلد ہی شائع ہوں گے۔

ایک قابل توجہ سوال
حضرت شاہ صاحب کی تصانیف ورسائل اردو میں کیوں نہیں؟

شاہ صاحب کی اس وقت تک جو تصانیف اور تحریریں دریافت ہیں، وہ تمام عربی یا فارسی میں ہیں، شاہ صاحب کی اردو میں کوئی تحریر، فتویٰ اور خط بھی اب تک علم میں نہیں ہے، حالانکہ شاہ صاحب کے دور میں دلی میں اردو کا چلن عام تھا، خود شاہ صاحب کے خانوادہ میں حضرت شاہ عبدالقادر کا نادر روزگار ترجمہ قرآن، موضح قرآن اس کی سب سے بڑی شہادت ہے، اس کے بعد شاہ رفیع الدین سے منسوب ترجمہ قرآن (۱۰۷) اور رسالہ راہ نجات (۱۰۸) یہ دونوں بھی اردو میں لکھے گئے، اسی طرح مولانا عبدالحی صاحب بڈھانوی کا ترجمۂ قرآن کریم، جو ترجمہ شاہ رفیع الدین کے نام سے چھپتا ہے اور لغت قرآن مجید (کوکب دری) اسی طرح شاہ محمد اسماعیل شہید کی انقلابی کتاب ''تقویۃ الایمان'' سب اردو میں ہیں اور یہ روایت گذر چکی ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے صاحبزادگان کو اردو سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد کی مجلس میں بیٹھنے کی ہدایت کی تھی، اس لیے بلاشبہہ شاہ عبدالعزیز بھی اعلیٰ درجہ کی اردو جانتے تھے، جیسا کہ شاہ صاحب کی بعض فارسی تحریروں سے واضح ہے کہ شاہ صاحب اردو کے نکات اور فنی مباحث سے اساتذہ فن کی طرح واقف اور ان کے بڑے ماہر تھے، مگر اس کے باوجود

حواشی

(۷۴) مطبوعہ مجتبائی ۱۳۱۱ھ (طبع سوم)۔(۷۵) تمہید تحفہ اثنا عشریہ، مطبع ثمر ہند لکھنؤ، ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء۔(۷۶) تمہید، تحفہ اثنا عشریہ، مطبع ثمر ہند لکھنؤ، ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء۔(۷۷) تمہید، تحفہ اثنا عشریہ، مطبع ثمر ہند لکھنؤ، ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء۔(۷۸) ملاحظہ ہو: فہرست نسخہائے خطی فارسی کتاب خانہ رضا لائبریری رام پور، ص: ۹۲، ج ا، ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء۔(۷۹) فخر المطابع کی اشاعت اور اس کے بعد کی متعدد طباعتیں، ہمارے ذخیرہ میں بفضلہٖ تعالیٰ موجود ہیں۔ مطبع فخر المطابع حافظ نیاز احمد کیرانوی کا پریس تھا، جس کے وارث ان کے فرزند حافظ عبداللہ ہوئے، حافظ نیاز احمد کیرانہ کے رہنے والے تھے اور شمالی ہندوستان، خصوصاً دہلی میں قائم سب سے پہلے سلطان المطابع کے مہتمم و نگراں تھے، مطبع سلطان المطابع بہادر شاہ ظفر کی ہدایت پر لال قلعہ دہلی میں قائم کیا گیا تھا اور مغل خاندان کے کیرانہ (ضلع شاملی، مظفر نگر یوپی) سے مختلف روابط کی وجہ سے حافظ نیاز احمد کیرانوی کو اس کا منتظم و مہتمم بنایا گیا تھا، بعد میں حافظ نیاز احمد صاحب نے فخر المطابع کے نام سے اپنا پریس شہر میں کھول لیا تھا، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تک جاری رہا، ان دونوں مطابع کی متعدد مطبوعات ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔(۸۰) تحفۂ حسن سر سید احمد اور حالی کی صراحت کے مطابق ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء میں چھپا تھا، تحفۂ حسن سر سید احمد کے مجموعہ تصانیف، تصانیف احمدیہ میں شامل ہے، جس کو خود سر سید نے مرتب کیا تھا، جو علی گڈھ سے ۱۳۱۳ھ میں چھپی تھی، ص ۲۷، ۱۲۴ اور تحفۂ حسن مقالات سر سید، شیخ اسماعیل پانی پتی میں بھی شامل ہے، ص ۸۵۷، ۸۷۷ (طبع اول لاہور، ۱۹۶۵ء)(۸۱) شیعیت کے رد میں حضرت شاہ ولی اللہ کی تصانیف اور شاہ عبدالعزیز کی تحفہ اثنا عشریہ نے برصغیر ہند کی علمی، دینی دنیا میں ہلچل مچادی تھی، خصوصاً تحفہ نے یہاں کے دینی، مذہبی ماحول کو بے حد متاثر کیا، شیعیت کے جو اثرات بڑھتے جارہے تھے، ان پر مضبوط بندھ لگا، لاکھوں لوگوں کو اس کے ذریعہ سے ہدایت نصیب ہوئی اور وہ صحیح عقائد پر مستقیم ہو گئے، ظاہر ہے کہ اس پرزور کتاب کا شیعہ دنیا میں سخت ردعمل ہوا، شیعہ علماء نے اس کے جواب میں بہت کوشش اور جدوجہد کی، دسیوں چھوٹی بڑی کتابیں تحفہ کی تردید میں وجود میں آئیں، مگر اس بڑی کوشش اور ہزاروں صفحات کی تصنیف اور اشاعت کے باوجود، تحفہ کے اثرات میں کمی نہیں آئی اور اس کے دلائل کا صحیح جواب کسی سے نہ بن پڑا، اسی لیے آج تک اہل تشیع میں تحفہ سے ناگواری عام ہے، یہاں یہ بھی عرض کردینا چاہیے کہ مشہور شیعہ فاضل اطہر عباس رضوی نے شاہ عبدالعزیز پر اپنی انگریزی کتاب:

"SHAH ABD-AL-AZIZ PURITANISM, SECTARIAN, POLEMICS, AND JIHAD"

میں (ص ۳۵۷ سے ص ۴۲۷) تک (سہیل اکیڈمی لاہور ۲۰۰۴ء) تحفہ پر بحث کی ہے اور اس کے جو جوابات لکھے گئے ہیں، ان سب کا تعارف کرایا ہے۔ (۸۲) فہرست نسخہائے خطی فارسی کتاب خانہ رضا لائبریری رامپور ص ۹۳، ج ۱، ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء۔ (۸۳) تعارف کے لیے دیکھیے: خزینۃ المخطوطات (وضاحتی فہرست ٹونک) ص ۱۷۶، ج ۳، ٹونک ۱۹۸۴ء۔ (۸۴) علامہ شکری آلوسی کے مرتبہ نسخہ میں اسی طرح مطبع مجتبائیہ لکھا ہوا ہے، مگر مجھے اس کی صحت میں شبہہ ہے، اس لیے کہ بمبئی میں اس نام کا کوئی مطبع نہیں تھا، اگر مطبع کا نام صحیح ہے تو یہ دہلی کا مطبع ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ نام کچھ اور ہو، جو طباعت میں غلط ہو گیا ہو۔ (۸۵) فہرست مخطوطات شیرانی، ڈاکٹر بشیر حسین ص ۲۸۳، ج ۲، طبع اول جون ۱۹۶۹ء، لاہور۔ (۸۶) خزینۃ المخطوطات (ٹونک) مرتبہ مولانا محمد عمران خاں، ص ۲۶۹، ج ۴، طبع اول ۹۹-۱۹۹۸ء۔ (۸۷) فہرست میکروفلم نسخہائے خطی فارسی و عربی علی گڈھ، ص ۴۸۷، ج ۱، (دہلی ۲۰۰۰ء)۔ (۸۸) فہرست نسخہائے خطی فارسی کتاب خانہ رضا لائبریری رام پور، ص ۳۰۴، ج ۱، ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء، لاہور۔ (۸۹) ایضاً، ص ۳۰۸۔ (۹۰) جواہر وزواہر (فہرست مخطوطات اٹاوہ میوزیم) ص ۹۵، مرتبہ ابرار حسین فاروقی، ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۹ء، اٹاوہ، یوپی۔ (۹۱) فہرست نسخہائے خطی فارسی کتاب خانہ رضا لائبریری رامپور، ص ۳۶۴، ج ۱، ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء، لاہور۔ (۹۲) نزہۃ الخواطر ص ۲۵۵، ج ۷، (۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء)۔ (۹۳) اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، ڈاکٹر سلیم حامد، طبع اول بھوپال، ۱۹۶۵ء۔ (۹۴) سیر دہلی، مولانا شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری، ص ۷۵، (ریاض ہند، آگرہ)۔ (۹۵) فہرست نسخہائے خطی فارسی کتاب خانہ رضا لائبریری رام پور، ص ۳۶۰، ج ۱، ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء۔ (۹۶) خزینۃ المخطوطات مولانا عمران خاں ندوی (وضاحتی فہرست ٹونک) ص ۱۸۴، ج ۳، طبع اول، ۱۹۸۴ء۔ (۹۷) خزینۃ المخطوطات مولانا عمران خاں ندوی، ص ۲۵۱، جلد ۴، ایک اور نسخہ مکتوبہ ۱۲۶۷ھ، ص ۲۹۲، ج ۴، (طبع اول ۹۹-۱۹۹۸ء) پر درج ہے۔ (۹۸) خزینۃ المخطوطات (ٹونک) ص ۲۵۴، ج ۴، (طبع اول ۹۹-۱۹۹۸ء)۔ (۹۹) اگرچہ اس نسخہ پر کاتب کا نام درج نہیں، لیکن جس مجموعہ میں یہ رسالہ شامل ہے، اس کی اور کتابیں روح اللہ کشمیری کے قلم سے ہیں، حاشیہ ہدیہ سنیہ اور ان رسائل کا قلم ایک ہے، اس لیے خیال ہے کہ یہ بھی روح اللہ کے قلم سے ہے۔ (۱۰۰) شاہ رفیع الدین کے رسائل کی تفصیل کسی اور موقع پر ان کے احوال میں درج ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ! (۱۰۱) میں اس نسخہ سے استفادہ کے لیے جناب ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی صاحب (نگراں رضا لائبریری رام پور) کا ممنون ہوں، میں رضا لائبریری گیا تو اصلاحی صاحب نے از راہ عنایت اس سے استفادہ کی سہولت بہم پہنچائی۔ شکریہ! (۱۰۲) سید ابوالقاسم عرف میر قدرت اللہ نے اس کا ترجمہ کیا تھا، اس کا ذکر فہرست مخطوطات شفیع، پروفیسر مولوی محمد شفیع صاحب (پنجاب یونیورسٹی لاہور) ص ۶۴ پر

ہے، یہ رسالہ مطبع نامی لکھنؤ سے ۱۳-۱۳۱۲ھ/ (۱۸۹۵ء) میں شائع بھی ہو چکا ہے، جو صولت پبلک لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔(۱۰۳) سر الشہادتین کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر مطبع مصطفائی کانپور ۱۲۵۷ھ/ (۱۸۴۱ء) میں شائع ہو چکا ہے۔(۱۰۴) اس کا خطی نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔(۱۰۵) اس اطلاع کے لیے مکرمی مولانا شعائر اللہ خاں صاحب، رام پور کا ممنون ہوں۔(۱۰۶) تذکرہ جواہر زواہر (فہرست مخطوطات فارسی اٹاوہ میوزیم) مرتبہ ابرار حسین فاروقی، ص ۹۶-۹۵ (طبع اول اٹاوہ ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۹ء)، اٹاوہ میوزیم کا پورا ذخیرہ مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ منتقل ہو گیا تھا جو اٹاوہ کلیکشن کے نام سے آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔(۱۰۷) شاہ رفیع الدین کے نام سے جو ترجمہ قرآن مجید معروف ہے اور عموماً پڑھا جاتا ہے، اس کے شاہ صاحب سے انتساب میں علمی تاریخی طور پر بہت شبہہ ہے، مفصل معلومات کے لیے دیکھیے راقم سطور کا مضمون: ''کیا قرآن مجید کے ایک معروف اردو ترجمہ کا حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی سے انتساب صحیح ہے''؟ یہ مضمون اول مجلہ ''فکر ونظر'' اسلام آباد (شعبان، ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ/ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۴ء) میں شائع ہوا تھا، مگر نہایت غلط چھپا تھا، مدیر فکر ونظر نے اس میں بالکل بے محل اور فضول ترمیمات کر دی تھیں، بعد میں مرتب کی اصل تحریر کے مطابق ماہنامہ ''ترجمان دارالعلوم'' دہلی سے دو قسطوں میں چھپا، صفر ۱۴۲۷ھ/ مارچ ۲۰۰۶ء، شمارہ ۷، ج ۲، ربیع الاول، ربیع الآخر ۱۴۲۷ھ/ اپریل، مئی ۲۰۰۶ء (شمارہ ۸-۹، ج ۲)۔(۱۰۸) راہ نجات، اردو دینیات کی ایک عام کتاب تھی، جو میرے بچپن تک مدرسوں میں پڑھائی جاتی تھی، اس کو عام طور سے شاہ رفیع الدین کی تالیف سمجھا جاتا ہے، مگر اس کا بھی شاہ صاحب سے انتساب ہے، شاہ صاحب کی تالیف نہیں، یہ حافظ محمد علی پانی پتی کی تالیف ہے، حافظ محمد علی ان تین آدمیوں میں سے ہیں، قاضی ثناء اللہ پانی پتی (صاحب تفسیر مظہری) نے جن کے لیے وصیت فرمائی تھی کہ ان تینوں میں سے جو موجود ہو، وہ میری (قاضی صاحب) نماز جنازہ پڑھائے۔

اسلامی مدارس کا تسلسل اور ہندوستان کی پہلی دینی درسگاہ مدرسہ باقیات صالحات، ویلور

ڈاکٹر راہیؔ فدائی ☆

(۲)

قیام مدرسہ کے دوسرے ہی سال بانی مدرسہ باقیات شاہ عبدالوہاب قادری ویلوری کا نکاح بتاریخ ۲۵/شعبان ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء بروز پنجشنبہ رضیہ امیر بی بی صاحبہ سے ہوا۔ جن کے بطن سے ۲۳/جمادی الاول ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء بروز پنجشنبہ مولانا قاری ضیاء الدین محمد عبدالقادر تولد ہوئے۔ یہ ۱۲۸۱ھ کا سال ہی تھا جس میں حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری نقوی ویلوری معروف بہ قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ) نے بیعت وخرقۂ خلافت سے نوازا تھا اور اپنی گراں قدر تصنیف ''جواہر السلوک'' کی طباعت واشاعت کی ذمہ داری بھی سونپی تھی، یہ تصنیف ۱۲۸۳ھ میں شاہ عبدالوہاب قادری کے اہتمام سے شائع ہوئی، اسی واقعہ کو ان کے شاگرد ومرید مولانا محمد اسماعیل تروپتی ابن شاہ محمد لطف اللہ ویلوری نے اشعار میں اس طرح رقم کیا ہے۔

''گفت او را شیخ او ''وہاب خیر'' لا جرم شد خیر ذاتش بہر دیں
اے زہے خوش قسمتے وہاب خیر داد او را خرقۂ عرفان و یقیں
ہر دو تصنیفات خود تلقین داد مطمئن کرد از بدیہیات دیں
پس حوالت کرد و گفت ایں طبع کن من سپردم جوہرِ عرشِ بریں
من ترا دادم کہ ایں گنج سلوک این حقائق مایۂ روح الامیں'' (۱)

شاہ صاحب کے گھر میں ۱۲۷۹ھ میں مدرسہ شروع ہوا تو تشنہ گان علوم اس سرچشمہ فیض سے

☆ ہاؤس نمبر ۲۱۸، گراؤنڈ فلور سکنڈ بی کراس، اایچ، بی، آر، فورتھ بلاک، بنگلور۔ (موبائل نمبر: 9448166536)

سیراب ہونے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ جب مکان کی وسعت ناکافی ہوئی تو شاہ صاحب کے مدرسہ کو گھر کے قریب واقع نواب صاحب کی مسجد کے صحن میں منتقل کر دیا۔ شاہ صاحب کے ایک نامور خلیفہ حضرت مولانا شاکر وانم باڑوی نے طلبہ کی کثرت کا ذکر اشعار میں اس طرح کیا ہے:

"طلبا میں جو شوق پاتے تھے　　گھر میں جا کر انہیں پڑھاتے تھے
جس کو یہ ذائقہ چکاتے تھے　　آپ سے آپ دوڑ آتے تھے
پھر تو طلاب کا ہوا یہ ہجوم　　بن گیا گھر میں درسگاہ علوم
آتے اہل طلب جو باہر سے　　دیتے ان کو طعام تک گھر سے
دُر برستے زبانِ اطہر سے　　موسلا دار جیسے مینہ برسے
کیا کہوں ہم نشیں کہ وہ کیا تھے　　چشمۂ فیض دین و دنیا تھے" (۲)

مدرسہ گھر سے صحن مسجد میں جب منتقل ہوا تو مدرسہ کے اخراجات کے لیے اہل ثروت و اصحاب ذوق سے مالی تعاون حاصل کرنے کا ارادہ فرمایا، اس کے لیے ٹمل ناڈو کے مختلف شہروں میں جا کر وعظ و تذکیر کے ساتھ مدرسہ کے تعاون کی اپیل کی، جن سے مرد و خواتین سب نے متاثر ہو کر مدرسہ کا خوب تعاون کیا۔

شاہ صاحب کی زندگی نہایت مسرور و مطمئن گزر رہی تھی کہ اہلیہ محترمہ داغ مفارقت دے گئیں، یہ سانحہ اندوہ ناک تھا لیکن نظام تعلیم و تدریس میں کوئی فرق آنے نہیں دیا۔ یہ سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا، پھر ۱۵؍شعبان ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء کو عازم حج بیت اللہ ہو گئے۔ سرزمین حرم میں ایک سال اور آٹھ ماہ کا عرصہ گزارا اور پھر ماہ ربیع الثانی ۱۲۸۶ھ میں وطن ویلور لوٹ آئے، حرم شریف کے قیام کے دوران علم حدیث کی سندیں مولانا سید حسین پشاوری نزیل مکہ اور مفتیٔ حرم شیخ احمد دحلان شافعی سے حاصل کیں علاوہ ازیں اپنے استاذ قدیم علامہ رحمت اللہ کیرانوی اور علامہ محمد نواب سے بھی استفادہ کیا۔ بقول مولانا حکیم سید عبدالحی لکھنوی (متوفی ۱۹۲۳ء):

"ثمّ سافر الیٰ مکة المکرمة و اخذ عن الشیخ رحمة اللّٰہ بن خلیل العثمانی الکیرانوی والعلامہ ملّا محمد نواب الھندی المھاجر الی مکہ و اخذ الحدیث عن الشیخ احمد دحلان الشافعی

مدرس الحرم الشریف و السید حسین المہاجر"۔(۳)

جس زمانے میں حرم شریف میں فروکش تھے، انہیں دنوں امام العارفین مولانا شاہ امداداللہ ہندوستان سے ہجرت کرکے مکہ مکرمہ پہنچ چکے تھے، اس زریں موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ صاحب نے شاہ امداداللہ سے فیض روحانی حاصل کرنے کا ارادہ کیا، اس سے پیش تر حضرت قطب ویلور علیہ الرحمۃ کی خلافت سے بہرہ مند ہو چکے تھے، اس لیے حضرت شاہ امداداللہ مہاجر مکیؒ نے جملہ سلاسل وطرق کی اجازت مرحمت فرماتے ہوئے اپنی خلافت سے نوازا۔ اس واقعہ کو حضرت شاکر وانم باڑی نے اپنی مثنوی میں یوں بیان کیا:

"ہوا مکہ میں آپ کا جو ورود | جو کہ ہے اک جہان کا مسجود
جس کو کہتے ہیں بیت ربّ ودود | دو مہاجر ولی تھے واں موجود
چاہتیں دونوں سے رحمت و امداد | فیض سے ان کے پائی دل کی مراد
آپ کے جملۂ مشائخ سے | حاجی امداد ایک حضرت تھے
گرچہ مکہ میں وہ رہا کرتے | جمعہ لیکن مدینہ میں پڑھتے
کیا ہی تاثیر فیض صحبت تھی | آپ میں بھی وہی کرامت تھی
الغرض شوق درس عرفاں میں | کی رسائی ہر اک دبستاں میں
آرزوئے وصال جاناں میں | سعی کی چار سوئے امکاں میں
جستجو یاں مفید مطلب ہے | جستجو میں کلید مطلب ہے" (۴)

تیسرے شعر میں رحمت و امداد سے مراد رحمت اللہ کیرانوی اور شاہ امداداللہ مہاجر مکی ہیں۔

شاہ صاحب نے مکہ مکرمہ سے واپسی کے بعد مدرسہ کی تشکیل جدید کی۔ ۱۲۸۶ھ سے ۱۲۹۲ھ تک صحن مسجد میں چھ سال عمدہ نظم ونسق کے ساتھ جاری رکھا، کتابوں کی فراہمی کے ساتھ خورد ونوش کا بھی معقول انتظام تھا، مدرسہ کی شہرت جنوب کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی تھی، جس کے نتیجے میں طلبہ کی کثرت ہوگئی تو اپنے بہی خواہوں کی مدد سے مسجد کے متصل جنوبی سمت میں ایک خوبصورت دومنزلہ چوکور عمارت بنوائی اور اس میں مدرسہ منتقل کردیا، بیرون ملک سے بھی تشنہ گان علوم بہ کثرت اس منبع انوار کی طرف رجوع ہونے لگے۔ اس صورت حال میں مدرسہ کے مسائل بھی بڑھنے لگے تو مالی

امور کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک انتظامی کمیٹی بتاریخ ۶/ جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء تشکیل دی، جس میں شہر اور بیرون شہر سے انیس اراکین منتخب کیے گئے۔ مدرسہ کا اب تک کوئی نام نہیں تھا، لوگوں کی خواہش ہوئی کہ شاہ صاحب کے نام سے موسوم ہو لیکن انہوں نے سورۂ کہف کی آیت کریمہ ''وَالْبٰقِیَاتُ الصّٰلِحَاتُ خیرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَواباً وخَیرٌ عَملاً'' سے اخذ کرتے ہوئے نام ''مدرسۂ باقیات صالحات'' رکھا۔ مدرسۂ باقیات اسی نہج پر کئی سالوں تک جاری رہا، بتاریخ ۶/ شعبان ۱۳۰۵ھ مطابق ۲۸/ اپریل ۱۸۸۸ء مجلس شوریٰ کے مشورہ سے ۱۹/ آئین دوامی اور ۱۷/ آئین غیر دوامی جملہ ۳۶ قوانین وضع کیے اور کمیٹی کو رجسٹرڈ کراتے ہوئے حسب آرڈیننس نمبر ۲۱۔ ۱۸۶۰ء ''رجسٹرآف جوائنٹ اسٹاک کمپنیز'' کے دفتر میں ۲۸/ اپریل ۱۸۸۸ء ہی کو تمام قوانین رجسٹرڈ کردیے۔ اس طرح یہ ''مدرسہ باقیات صالحات'' جمہوری اور قانونی نظام کے تحت بغیر کسی انتشار و افتراق کے بحسن وخوبی جاری رہا اور ام المدارس کے درجہ بلند پر فائز ہوا۔

بانیٔ مدرسہ باقیات صالحات نے مدرسہ کے دستور اساسی قوانین کے تحت ایک ایسا قانون بھی درج کیا ہے جس کی مثال ہندوستان میں واقع مدرسوں اور دینی تعلیم گاہوں میں ناپید ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قانون کے تحت مدرسہ میں سنی اور شیعہ دونوں طبقوں کے طالب علموں کے داخلہ کی گنجائش رکھی گئی۔ دستور کے الفاظ یہ ہیں:

> ''ہر ایک مسلمان عموماً مدرسہ میں داخل ہونے اور تعلیم پانے کا مجاز ہے،
> لیکن جو شخص فرقۂ اہل السنۃ والجماعۃ سے نہ ہو وہ بھی بایں شرط کہ اس سے کسی قسم کا شرو فساد نہ ہووے، داخل مدرسہ کیا جائے گا''۔ (۵)

اس قانون کے وضع کرنے میں ایک دلچسپ واقعہ ہے جو اتحاد بین المسلمین کی مثال ہے، واقعہ یہ ہے کہ مدرسہ کی قدیم دومنزلہ مربع عمارت طلبہ کے لیے ناکافی ہوگئی تو شاہ صاحب کو یہ خیال آیا کہ مدرسہ کی توسیع کی جانی چاہیے۔ لیکن مشکل یہ تھی مدرسہ کے ایک جانب مسجد تھی اور دوسری جانب حضرات شیعہ کا محلہ ''علی پورا'' آباد تھا۔ علی پورا کے بزرگوں سے شاہ صاحب نے اس مسئلہ پر گفتگو کی تو سبھی حضرات نے بیک آواز مسرت وشادمانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم مدرسہ باقیات کی توسیع کے لیے اپنے مکان خالی کرکے مدرسہ کے حوالے کرتے ہیں، آپ جس طرح چاہیں انہیں استعمال

کریں۔شاہ صاحب کو اہل محلہ کا یہ جذبہ بے حد پسند آیا۔ یہ جدید دومنزلہ حسین و جمیل عمارت بانیٔ باقیات علیہ الرحمہ کے حین حیات پایۂ تکمیل کو پہنچ نہ سکی۔البتہ یہ عمارت جس کا نام دارالاقامہ بیادگار اعلیٰ حضرت شاہ عبدالوہاب قادریؒ رکھا گیا تھا جو ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں مکمل ہوئی اور اس کا افتتاح ۱۹۲۵ء میں صوبۂ مدراس کے گورنر لارڈ وائی کوٹ گوشن (Lord Viscoot Ghosion) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔اس جدید عمارت کی دیوار میں نصب شدہ کتبہ آج بھی موجود ہے۔

باقیات صالحات کے قیام کو چھبیس سال ہوگئے تو اس کا اولین جلسۂ دستار بندی شاہ صاحب کی صدارت میں تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا، جس میں آٹھ ہزار مہمانوں نے شرکت کی، مہمان خصوصی ''دارالعلوم دیوبند'' کے صدرالمدرسین حضرت مولانا ابوالخیرات احمد تلمیذ امام بخش صہبائی تھے۔ یہ جلسہ ۱۸۸۸ء میں منعقد ہوا تھا، جس میں مولوی عالم کے سترہ فارغین اور مولوی فاضل کے دو فارغ طلبہ نے سند حاصل کیں۔درجۂ فاضل کے طلبہ میں شاہ صاحب کے فرزند مولانا قاری ضیاءالدین محمد اور برادرزادے غلام محی الدین قادری تھے۔(۶) جلسے کی تیاری کے لیے شاہ صاحب نے شمالی ہند کا دورہ کیا، پہلا سفر کیرانہ کا تھا، جہاں علامہ رحمت اللہ کیرانوی فروکش تھے، دوسرے سفر میں شیخ المشائخ قطب ارشاد حضرت فضل رحمان گنج مرادآبادی (متوفی ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مدرسہ کی ترقی و ترویج کے لیے دعا کی درخواست کی، حضرت شاہ فضل رحمان نے اسی ملاقات میں سلسلۂ نقشبندیہ میں اجازت و خلافت عطا فرمائی اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ صاحب کے عزیز شاگرد مولانا محمد اعظم سفیر بلنج پوری نے کہا:

''جب سوئے ہند بہر ضرورت ہوئے رواں — جو اہل فضل نامی تھے، سب سے ملے وہاں
مولانا فضل رحمن ولی ایک تھے جہاں — پائے ہیں فیض ان سے بھی جا کروہ بے کراں
خلوت میں ان کے آپ وہاں ہوکے کامیاب — یاں طالبان حق کو کیے ہیں وہ فیض یاب
وقت وداع آپ نے کی عرض مرشدی — کچھ میرے مدرسہ کو دعا کیجیے ولی
جب کی دعا ولی نے کہ یا قادر و غنی — وہ مدرسہ ہو اوج ترقی پہ ہر گھڑی
جیسی دعا وہ مانگے بدرگاہ ذوالجلال — ویسا ہی مدرسہ کو ملا درجۂ کمال''(۷)

یہ حضرت گنج مرادآبادی کی دعاؤں کا ثمرہ تھا کہ مدرسہ کا صدسالہ سہ روزہ جلسہ بتاریخ ۳۰؍

نومبر اور یکم و دوم دسمبر ۱۹۷۴ء بڑے ہی پُروقار طور پر ہندوستان کے مدارس دینیہ کی تاریخ میں پہلی بار منعقد ہوا۔ اجلاس کی افتتاحی تقریب کی صدارت مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے فرمائی جس میں فرمایا کہ مدرسہ باقیات صالحات، ہندوستان کا اولین مدرسہ ہے جس کا قیام ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں علامہ شاہ عبدالوہاب قادری کے ہاتھوں ہوا ہے، دراصل مدرسہ کے صدسالہ جلسہ کا انعقاد بارہ سال کی تاخیر کے بعد ہوا۔ اس کے مدارجِ عروج طے کرنے کی رفتار الحمدللہ کافی تیز ہے، مدرسہ کو قائم ہوئے ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزرا تو ۱۷/ ۱۸/ صفر المظفر ۱۴۳۵ھ مطابق ۲۱/ ۲۲/ دسمبر ۲۰۱۳ء کو مدرسۂ باقیات صالحات جواب ''جامعہ باقیات صالحات'' بن چکا ہے، کے ذمہ داروں نے ڈیڑھ سو سالہ جلسہ بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ منایا، جس میں تقریباً چالیس ہزار علمائے کرام نے شرکت فرمائی۔ اس میں ہندوستان بھر کی معروف و مشہور جامعات و مدارس کے ذمہ دار بھی تھے۔ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مہتمم علامہ ماجد مسعود حشیم عثمانی نے بانیٔ جامعہ باقیات اور اپنے جدامجد حضرت علامہ رحمت اللہ کیرانوی کے تعلقات کے حوالے سے بہترین تقریر فرمائی۔

شاہ عبدالوہاب قادری علیہ الرحمہ (۱۲۴۷ھ تا ۱۳۳۷ھ) کا انتقال نوّے سال کی عمر میں بہ مقام ویلور ہوا۔ قلعے کے وسیع و عریض میدان میں ہزاروں لوگوں نے نمازِ جنازہ ادا کی اور مدرسہ کے شمالی حصہ میں مسجد کے روبرو تدفین عمل میں آئی، وفات کے بعد مزار پر گنبد تعمیر کیا گیا جس میں ان کے صاحبزادے خان بہادر علامہ قاری ضیاء الدین محمد قادری (۱۲۸۱ھ تا ۱۳۶۰ھ) اپنے والد ماجد کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں، رحمہم اللہ۔ شاہ صاحب کی وفات سے پیشتر شمس العلماء سید شاہ عبداللطیف (رابع) قادری ویلوری معروف بہ حضرت مکیؒ (۱۲۹۸ھ تا ۱۳۳۸ھ) نے شب شنبہ خواب میں دیکھا کہ قلعۂ ویلور کی خندق کا پانی خشک ہوگیا ہے، حضرت مکی نے اس کی تعبیر میں فرمایا ''فیاض زماں'' کے انتقال کی طرف اشارہ ہے، اس کے دوسرے ہی دن شاہ صاحب کی وفات ہوئی۔ حضرت مکی نے نماز جنازہ کی امامت فرمائی۔ حضرت سفیر بلنج پوری نے ''آفتابِ مجمع الحسنات پنہاں ہوگیا'' کے مصرعے سے تاریخ وفات ۱۳۳۷ھ برآمد کی۔ حضرت شاکر وانم باڑی نے ہجری اور عیسوی دونوں تاریخوں میں قطعات تحریر کیے۔ ان کے آخری شعر ملاحظہ ہوں:

''سرِ اخلاص سے شاکر نے یہ تاریخ کہی ماتم اہل جہاں رحلت عبدالوہاب
۱۳۳۷ھ

شاکر برقم آر، پئے سال وصالش شمس العلما اہل صفا رفتہ بجنّت'' (۸)
۱۹۱۹ء

علامہ ضیاء الدین احمد امانی نے اس طرح کہا:

''لب افسوس سے میں نے کہا سن ہوا غائب جنوبی ہند کا قطب''(۹)
۱۳۳۷ھ

عبدالغنی ممنون کے قطعہ تاریخ کا آخری شعر ہے:

''فکر سن ممنون نے جب کی تو ہاتف نے کہا رحلتِ قبلہ ولی الہند شہہ عبدالوہاب'' (۱۰)

شاہ عبدالوہاب قادری کی موجودگی میں مدرسہ کی دستار بندی کا اولین جلسہ ۱۳۰۵ھ میں منعقد ہوا جس کی تفصیل قبل ازیں بیان کی گئی، اس جلسہ کے تقریباً انیس سال بعد بتاریخ ۶/جمادی الآخر ۱۳۲۴ھ مطابق ۲۹/جولائی ۱۹۰۶ء باقیات صالحات کا دوسرا شاندار جلسۂ دستار بندی پُروقار طور پر منعقد ہوا جس میں تقریباً پانچ ہزار افراد شریک رہے، اس اجلاس میں ۵۷/علمائے کرام نے سند فراغت حاصل کی (۱۱)۔ اس عظیم جلسہ کے دوسرے دن ۷/جمادی الآخر کو ''کل جنوبی ہند تعلیمی کانفرنس'' کا انعقاد ہوا، اس کی صدارت بانیٔ مدرسہ کے صاحبزادے خان بہادر علامہ قاری ضیاء الدین محمد قادری نے فرمائی۔ جنوب کے تمام صوبہ جات کے مشاہیر علما وفضلا کی شرکت اس اجلاس کی کامیابی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ اس جلسہ میں نصاب تعلیم، مسائل طلبۃ العلوم اور دینی وعصری مدارس کے درمیان واقع خلیج پُر کرنے پر گفتگو کی گئی۔ جس کے نتیجے میں اکیس تجاویز منظور ہوئیں۔ اس کانفرنس کی بنیاد سرسید احمد خاں کے زیر سرپرستی قائم شدہ ''محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس'' کا پندرہواں سالانہ جلسہ تھا جو بتاریخ ۲۷/۲۸/۲۹/دسمبر ۱۹۰۱ء پہلی بار شہر مدراس میں منعقد ہوا اور اسے نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی صاحب بہادر کی سرپرستی حاصل تھی (۱۲)۔ جس کو کامیاب بنانے میں بانیٔ مدرسہ کے فرزند علامہ ضیاء الدین محمد نے نہ صرف سرگرمی دکھائی بلکہ دامے درمے بھی اس کی تائید فرمائی۔ اس موقع پر مدرسہ باقیات صالحات کے صدر المدرسین شمس العلماء عبدالجبارؒ (متوفی ۱۳۵۳ھ) نے اس وقت کے تعلیمی نظام پر سیر حاصل تقریر کی، اس کے بعد اس قبیل کے جلسے سالانہ منعقد کرنے کی تجویز پیش کی گئی مگر افسوس کہ ذمہ داران ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' سے اس پر عمل نہ ہوسکا۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے علامہ ضیاء الدین محمد نے اس کل ہند کانفرنس کو جنوبی ہند تک محدود کرتے ہوئے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری لانے کی سعی بلیغ کی۔

بانی مدرسہ کے انتقال کے بعد جامعہ باقیات صالحات کا تیسرا جلسۂ دستار بندی بتاریخ ۲۴/

شوال المکرم ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۴ء بروز دوشنبہ اعلیٰ پیمانے پر منعقد ہوا، جس کی صدارت مولانا ضیاء الدین محمد نے فرمائی۔ اس جلسے کے بعد جامعہ باقیات میں تعلیمی سال کے اختتام پر ہر سال ماہ شعبان میں دستار بندی کے جلسوں کا سلسلہ جاری ہوا، جو اب تک قائم ہے۔ علاوہ ازیں مدرسہ میں ''مجلس مباحثۂ علمیہ'' کے نام سے اساتذہ کرام وعلمائے عظام کی انجمن قائم کی گئی جس میں کسی ایک مسئلہ پر بحث ومباحثہ اور تبادلۂ خیال کھلی فضا میں ہوتا رہتا تھا۔ یہاں ایک مجلس کا اجمالی تذکرہ پیش کرنا بے جانہ ہوگا:

''۱۴؍صفر ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸؍ستمبر ۱۸۹۱ء روز جمعہ بہ مقام مدرسہ مذکورہ انجمن کا اجلاس ہوا، جس کی صدارت حضرت العلام مولانا غلام محی الدین صاحب صدرالمدرسین نے فرمائی۔ شرکائے مجلس میں علامہ عبدالقادر بادشاہ، علامہ قاری ضیاء الدین محمد، علامہ فقیہ محی الدین، مولانا عبدالعزیز وغیرہ شامل تھے۔ ناظم اجلاس مولانا عبدالعزیز کو بنایا گیا اور یہ سوال پوچھا گیا کہ ''**الھند دارُ حربٍ ام لا**'' یعنی ہندوستان دارالحرب ہے کہ نہیں؟ اس پر بحث وتکرار کے بعد دلائل مشتبہ پیش ہوئے مگر خدشہ سے خالی نہ ہونے اور اس مسئلہ کی تحقیق پر کوئی نفع مرتب نہ ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ خارج کر دیا گیا''۔

جامعہ باقیات صالحات کی مذکورہ بالا تمام خصوصیات و امتیازات کی بنا پر اس کی جمہوری ساخت پر نظر کرتے ہوئے یہ کہنا بجاطور پر صحیح ہے کہ ''ہندوستان کی اولین جمہوری دینی درس گاہ، مدرسۂ باقیات صالحات، ویلور ہے''۔

ماخذ وحواشی

(۱) عبدالقادر گنڈ وشاہ مولانا شاکر وانم باڑی، ''مرثیہ انتقال'' مطبع نامی، مدراس، ۱۳۳۷ھ ص ۱۵۔ (۲) عبدالحی سید حکیم مولانا لکھنوی ''نزہۃ الخواطر'' مطبوعہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد (دکن) بعنوان تذکرۂ حضرت مولانا عبدالوہاب ویلوریؒ، ج ۸۔ (۳) ''مرثیۂ انتقال'' مطبوعہ ۱۳۳۷ھ مطبع نامی مدراس، ص ۲۰۔ (۴) ''دستور اساسی وقوانین مجلس شوریٰ'' مدرسہ باقیات صالحات، ویلور، باہتمام علامہ ابوالسعو د احمد باقوی، مطبوعہ ماہ جمادی الآخر ۱۳۷۴ھ مطابق فروری ۱۹۵۵ء۔ مطبع بلال پریس، مدراس، ص ۱، ۲، ۳۔ (۵) روئداد مدرسۂ باقیات صالحات، ویلور بابت ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۵ء، ص ۴۱۔ (۶) محمد اعظم مولانا سفیر بلنج پوری ''فغان اعظم'' مطبوعہ شوکۃ الاسلام پریس، بنگلور، ۱۹۱۹ء ص ۷، ۸۔ (۷) عبدالقادر گنڈ وحضرت مولانا شاکر وانم باڑی، ''مرثیہ انتقال'' مطبوعہ مطبع نامی، مدراس، ۱۹۱۹ء، ص ۲۶۔ ۲۷۔ (۸) ضیاء الدین احمد امانی علامہ ''نوحہ غم''، مطبع عزیزی، مدراس، ۱۹۱۹ء، ص ۸۔ (۹) عبدالغنی پٹیل ممنون ویلوری ''اظہار غم''، مطبع رزاقیہ مدراس، ۱۹۱۹ء، ص ۸۔ (۱۰) فدوی باقوی ویلوری، حضرت مولانا، مجدد جنوب، مطبوعہ ۱۹۷۴ء، ص ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ (۱۱) روئداد اجلاس کانفرنس، بزیر اہتمام محمد فاروق علی خاں صوفی، مطبوعہ مطبع مفید عام، آگرہ ۱۹۰۲ء۔ (۱۲) مجدد جنوب، ص ۱۲۵۔ ۱۲۶

فتاویٰ شامی (حاشیہ ابن عابدین)

مفتی ضیاء الدین عارفی قاسمی☆

فقہ اسلامی امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک عظیم سرمایہ ہے، جس کے مآخذ اصلی قرآن و حدیث ہیں۔ دور صحابہ تک فقہ کی باقاعدہ تدوین عمل میں نہیں آئی تھی، بلکہ احکام ومسائل کا دارومدار یادداشت اور ذاتی نوشتوں پر تھا۔ دور تابعین علم فقہ کا ایک زریں عہد تھا جس میں فقہاء کی کثیر تعداد تیار ہوگئی اور اس دور کے آخر میں علم فقہ کی تدوین کی علما نے ضرورت محسوس کی، چنانچہ سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ نے اس کام کی ابتداء کی اور ان کے شاگردوں نے اس کو بام عروج تک پہنچایا، اس طرح فقہ حنفی کی بنیاد پڑی اور اس کے ساتھ قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی وغیرہ مکاتب فقہ معرض وجود میں آئے، متاخرین نے اس میں گراں قدر اضافے کیے اور مدونہ فقہی ابواب و ترتیب پر احکام ومسائل پر جامع مدلل کتابیں زیب قرطاس کی گئیں اور پھر فقہی احکام پر مشتمل کتابوں کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہوا، جو اب تک جاری ہے۔ چنانچہ فقہ پر مشتمل کتابوں کا ایک ایسا عظیم سرمایہ تیار ہوگیا کہ ان کا تذکرہ کرنے کے لیے سیکڑوں صفحات بھی ناکافی ہیں۔

ان ہی کتابوں میں حنفی فقہ کی مشہور ومعروف، متداول بین العلماء والفقہاء اور مستند وجامع کتاب ''فتاویٰ شامی'' ہے۔ یہ کتاب دراصل فقہ حنفی کی مقبول ترین کتاب ''الدرالمختار'' کا حاشیہ اور شرح ہے۔ درمختار علاء الدین محمد بن علی حصکفیؒ (متوفی ۱۰۸۸ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ظاہری اور معنوی دونوں حیثیت سے ممتاز ہے، اپنی ترتیب وتبویب، جامعیت اور فقہی جزئیات کے اعتبار سے انتہائی مستند اور جامع کتاب ہے، جس میں علامہ حصکفیؒ نے فقہ کی ۳۷ مستند کتابوں سے مسائل جمع کیے ہیں، جزئیات کا جو ذخیرہ اس کتاب میں پایا جاتا ہے وہ کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔ نیز

☆ ریسرچ اسکالر، سنی تھیولوجی، اے ایم یو، علی گڑھ۔ ziyaarifi@gmail.com(Mob:9319278456)

درمختار شیخ الاسلام شمس الدین محمد بن عبداللہ تمرتاشی (متوفی ۱۰۰۴ھ) کی معروف کتاب ''تنویر الابصار وجامع البحار'' (جو فقہ حنفی کا مشہور متن ہے) کی شرح ہے، تنویر الابصار فقہ کی دوسری بہت سی کتابوں سے اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے ممتاز ہے۔ اس میں دیگر متون سے زیادہ معتبر مسائل ذکر کیے گئے ہیں، بالخصوص ان تمام مسائل پر حاوی ہے جن کی آئے دن ضرورت ہوتی ہے، نیز اس میں مفتی بہ اقوال کا انتخاب کیا گیا ہے، یہ تحقیق وتدقیق کا عمدہ، دل پسند اور اہم ذخیرہ ہے۔

فتاویٰ شامی کا نام ''ردالمحتار علی الدرالمختار'' ہے اور یہ حاشیہ ابن عابدین اور فتاویٰ شامی کے نام سے علماء وفقہاء اور مفتیان کرام کے درمیان مشہور ومتداول ہے اور یہ اپنے زمانے کے مقبول عام و خاص شخصیت علامہ محمد امین بن عمر شامی (متوفی ۱۲۵۲ھ) کی تالیف ہے۔ وہ ابن عابدین اور علامہ شامی کے نام سے مشہور ہیں، علامہ شامیؒ اپنے زمانے کے مسلم مفتی اعظم تھے، ان کا فقہی مقام اتنا بلند تھا کہ صرف دمشق وشام ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام میں ان کی مقبولیت تھی۔ ان کا شمار متاخر دور کے جلیل القدر علماء میں ہوتا ہے، چالیس سے زیادہ تصنیفات ہیں جن میں سب سے مقبول ومعروف فتاویٰ شامی (حاشیہ ابن عابدین) ہے۔

علامہ شامیؒ نے ''فتاویٰ شامی'' ۱۲۴۹ھ میں تالیف فرمائی۔ فتاویٰ شامی کی تالیف میں انتہائی جانفشانی، تحقیق وجستجو اور تلاش وتتبع کا مظاہرہ کیا، سیکڑوں کتابوں سے رجوع کر کے ایسے ایسے مسائل و جزئیات کو حوالوں کے ساتھ نقل کیا ہے کہ دور حاضر کے علما وفقہا خصوصاً اہل فتاویٰ مسائل کی تخریج اور فتاویٰ نویسی میں بہت حد تک فقہ کی دیگر کتابوں سے بے نیاز ہو گئے۔ مفتی سلمان منصور پوری اس کتاب کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

یہ اس وقت فقہ حنفی کا سب سے مقبول اور مستند مجموعہ ہے، جس میں تمام کتب متقدمین و متاخرین کا عطر اور نچوڑ آ گیا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس کے مصنف علامہ محمد ابن عابدین شامیؒ (المتوفی ۱۲۵۲ھ) نقل میں اثبت ہیں، انہوں نے کتب فقہ سے جو عبارت وجزئیات اور حوالے نقل فرمائے ہیں وہ اصل کے موافق نکلے ہیں۔ اسی لیے اس کتاب کا وزن علمائے احناف کی نظر میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہے اور اس ایک کتاب نے بہت سی کتب فقہ سے مستغنی کر دیا ہے۔ مفتیان کرام کو چاہیے کہ اگر وہ کوئی جزئیہ یا مسئلہ کسی اور کتاب میں دیکھیں تو اسے شامی

سے ضرور ملالیں، تاکہ آخری اور راجح قول کا علم ہو سکے۔(۱)

''فتاویٰ شامی مترجم'' کے پیش لفظ میں تفصیل کے ساتھ کتاب کی تالیف کا تذکرہ ہے، جس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''علامہ ابن عابدین شامیؒ نے جب علمی دنیا میں قدم رکھا تو متاخرین فقہاء کی غالب تعداد ایک دوسرے سے کتابیں نقل کرنے میں مصروف تھی اور اکثر اس میں سہو اور خطا واقع ہوئی جو ان میں سے کسی سے پہلی بار صادر ہوئی، تو انہوں نے کمال ہمت اور جہد مسلسل کے ساتھ فقہی اقوال کو ان کے اصول کی روشنی میں دیکھا اور متقدمین کی طرف رجوع کر کے ان کی امہات الکتب کے ساتھ ان کا موازنہ اور مقابلہ کیا، اس طرح جہاں کہیں بھول اور خطا کا احساس ہوا اس کا ازالہ فرما کر راہ صواب کو اختیار کیا۔ علامہ شامی سے قبل متاخرین فقہا میں سے کوئی بھی اس مقام پر فائز نہ ہو سکا، انہوں نے زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھا اور بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ لوگوں کی حاجات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور باحسن انداز ان کی تلافی کے لیے فقہ حنفی کے اصول وفروع کے قواعد کے ضمن میں نئے نئے مسائل کا حل بیان فرمایا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ عبادات اور نکاح جیسے مسائل میں احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ہمیشہ محتاط فتویٰ دیا۔ جبکہ معاملات میں قواعد مذہب کی پاسداری کرتے ہوئے آسانی اور سہولت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش فرمائی۔ فتویٰ کے لیے انہی کی طرف لوگوں کا رجحان اور میلان تھا اور اس بارے میں انہی کو قبول عام حاصل تھا''(۲)

حقیقت یہی ہے کہ علامہ شامیؒ اس کی تالیف کے دوران مسائل کی تخریج میں اصل ماخذ کی طرف رجوع کیے بغیر مسائل نقل نہیں کرتے تھے۔ مسائل کی تنقیح، مشائخ کے اقوال کے درمیان تصحیح و ترجیح اور مجملات کی تفسیر وتوضیح میں یہ کتاب بے مثال ہے۔ اس کتاب کا متن درمختار اور اس کا متن تنویر الابصار یہ دونوں کتابیں پچھلی تمام کتب فقہ میں امتیازی مقام رکھتی ہیں، اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب شامی کا متن اتنی اہمیت کا حامل ہے تو اس کتاب کا مقام ومرتبہ کیا ہوگا۔ علامہ شامیؒ انتہائی محتاط شخصیت کے مالک تھے، مسائل کی تحقیق وتدقیق اور تصحیح میں احتیاط سے کام لیتے تھے، افراط و تفریط سے اجتناب کرتے تھے، بے ضرورت اپنی آراء پیش نہیں کرتے تھے، بلکہ کلی طور پر کتب فقہیہ پر اعتماد کرتے ہوئے، ان کے حوالے سے مسائل نقل فرماتے تھے۔ چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب اپنے والد محترم مفتی شفیع صاحب کا قول نقل فرماتے ہیں کہ:

''علامہ ابن عابدین شامیؒ انتہائی وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود اس قدر تقوی شعار اور محتاط بزرگ ہیں کہ عام طور سے اپنی ذمہ داری پر کوئی مسئلہ بیان نہیں کرتے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا اپنے سے پہلے کی کتابوں میں سے کسی نہ کسی کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں، اگر ان اقوال میں بظاہر تعارض ہوتو ان کو رفع کرنے کے لیے بھی حتی الامکان کسی دوسرے فقیہ کے قول کا سہارا لیتے ہیں اور جب تک بالکل مجبوری نہ ہو جائے خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرماتے اور جہاں ظاہر فرماتے ہیں وہاں بھی بالعموم آخر میں ''تامل'' یا ''تدبر'' کہہ کر بری ہو جاتے ہیں اور ذمہ داری قاری پر ڈال دیتے۔یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات الجھے ہوئے مسائل میں ہم جیسے لوگوں کو ان کی کتابوں سے مکمل شفا نہیں ہوتی''۔(۳)

فتاویٰ شامی کی اہمیت و افادیت خود علامہ شامیؒ کے بیان کردہ اس کتاب کی تالیف کے دوران محنت و مشقت، جانفشانی، تحقیق و تدقیق، مسائل کی تنقیح و تصحیح اور حوالہ جات کے اہتمام کے سلسلے میں کی ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ:

''بعض اوقات میں نے ان کتابوں میں موجود مسائل کو دوسری کتاب کی طرف منسوب کیا ہے تاکہ نقل کے تعدد کے ساتھ مزید پختگی پر دلالت کرے اس سے مراد اغراب اور انوکھا پن ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے، اور جہاں ان کے ساتھ اختلاف واقع ہوا اور صواب یا احسن ان کے خلاف تھا تو میں نے مقام کی مناسبت سے کلام کو ثابت کیا اور ایسے مقام پر میں نے (فافہم) کے قول کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔میں نے ادب و احترام کی خاطر صراحتاً ان پر اعتراض نہیں کیا۔مسائل اور ضوابط میں سے جو شرح میں موجود ہیں اس میں میں نے اصل مرجع کا التزام کیا ہے جس سے وہ مسائل منقول ہیں تاکہ بعض قیود اور شرائط ساقط نہ ہو جائیں۔اور میں نے اہم فروع اور بہت سے فوائد کا اضافہ کیا ہے اور بواعث کے اختلاف پر حوادث و وقائع میں سے مفید ابحاث، فائق نکات، مشکلات کا حل، پوشیدہ مسائل کا استخراج، مشکل مسائل کا انکشاف، مشکل وقائع کا بیان اور ارباب حواشی کی طرف سے ضعیف

اعتراضات کو دفع کرنے اور شارح محقق کی بات کو غلبہ دینے اور تاریک پردوں کے اٹھانے کی کوشش کی ہے اور ہر فرع کو اصل کی طرف منسوب کیا ہے اور ہر شے کی اس کے محل کی طرف نسبت کی ہے حتی کہ حجج ودلائل، مسائل کی تعلیلات کو اصل کی طرف منسوب کیا ہے اور جو میری کمزور فکر اور کوتاہ نظری کا نتیجہ ہے اس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور اس پر خود ہی آگاہ کیا ہے۔ میں نے قوی ترین مسئلہ مثلاً مفتی بہ مسئلہ اور مرجوح سے راجح کو بیان کرنے کی سعی بلیغ کی ہے جو فتاویٰ یا شروح میں مطلق ذکر کیا گیا ہے اور میں نے اس سلسلہ میں متاخرین ائمہ اعلام پر اعتماد کیا ہے"۔(۴)

ردالمحتار کی اہمیت میں یہ وجہیں بھی قابل ذکر ہیں:

پہلی یہ کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ دوسرے مصنّفین سے متاخر ہیں، انہوں نے پچھلے تمام فقہاء کی کتب کو سامنے رکھ کر کتاب تصنیف کی ہے، لہٰذا اس کتاب میں فقہائے امت کی بارہ صدیوں کی محنت اور تحقیقات کا نچوڑ آ گیا ہے۔

دوسری وجہ اس کتاب کا مستند ہونا ہے۔ مصنف نے کوئی بات نقل کرتے وقت صرف نقل پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ التزام کے ساتھ اہتمام کیا کہ اس بات کی تحقیق کی جائے کہ قائل اول کون تھے اور ان کی اپنی اصل عبارت کیا ہے؟

تیسری وجہ اس کتاب کی جامعیت ہے۔ مصنف محقق کی عادت ہے کہ سابقہ تمام اقوال ومباحث کو سامنے رکھ کر تطبیق یا ترجیح کی صورت بیان فرماتے ہیں۔ علمائے متقدمین کی کتب رسوخ فی العلم میں بہت بڑھ کر ہیں، لیکن مفتی کے لیے "ردالمحتار" سے استغناء نہیں۔ اسی وجہ سے یہ کتاب اپنے وقت تحریر سے آج تک مرجع اہل افتاء ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ محشی رحمہ اللہ انتہائی محتاط تھے۔(۶)

آخر میں اس کتاب کے تکملہ اور اس کے حاشیہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ علامہ شامیؒ کتاب کی تکمیل سے قبل ہی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے، چنانچہ صاحبزادے شیخ علاء الدین آفندیؒ نے اس کا تکملہ "قرۃ عیون الاخیار تکملہ ردالمحتار" کے نام سے تحریر فرمایا جسے فتاویٰ شامی کے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔ مفتی ابولبابہ تحریر فرماتے ہیں "جب علامہ شامیؒ نے ردالمحتار کی تسوید سے فارغ ہو کر

تبییض شروع کی تو ابھی کتاب القضاء کے مسائل شتی تک پہنچے تھے کہ انتقال فرما گئے، ان کے نسخہ پر موجود حواشی کی تبییض ان کے صاحبزادے نے مکمل کی، اس کے بعد انہوں نے تکملہ ردالمحتار کے نام سے ''شامیہ'' پر کچھ حواشی اور تعلیقات لکھیں''۔(۷)

علامہ عبدالقادر رافعیؒ نے فتاویٰ شامی پر ایک قیمتی حاشیہ تحریر فرمایا ہے، مفتی ابولبابہ نے اس کا تعارف اس طرح پیش کیا ہے ''ردالمحتار'' کے ساتھ آخری جلد ان تعلیقات کی ہوتی ہے جو العلامۃ الجلیل عبدالقادر بن مصطفےٰ الباری الرافعی (پیدائش ۱۲۴۸ھ/ وفات ۱۳۰۵ھ) کی تحریر کردہ ہیں۔ یہ مصر کے مفتیٔ اعظم اور اپنے وقت میں فقہ حنفی کے امام تھے اور ''ابوحنیفہ الصغیر'' کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ انہوں نے ''ردالمحتار'' کے نسخہ پر حواشی و تعلیقات لکھے اور آخری عمر تک اس پر اضافہ کرتے رہے۔ ان کے صاحبزادے نے ان کی تجرید کی اور والد ماجد کی وفات کے بعد ان کو شائع کیا''۔(۸)

حاصل یہ کہ اس کی تالیف سے لے کر اب تک علما و فقہا خاص طور پر مفتیان کرام کا مرجع خصوصاً حنفی مسلک کے مفتیوں کا سب سے عظیم ماخذ ہے۔ یہ فقہائے احناف کی کتابوں کا خلاصہ ہے، فروعات و جزئیات کی کثرت، مسائل کی تنقیح و تصحیح اور ترجیح کے اعتبار سے کتاب بے نظیر ہے۔ صاحب کتاب نے ایک ایک مسئلہ کی تحقیق میں سیکڑوں کتابوں سے رجوع کرنے کے بعد مسائل نقل کیے ہیں، محض متاخرین کی نقل پر اعتماد کرنے کے بجائے اصل ماخذ کی طرف رجوع کر کے ہر مسئلہ کی تحقیق و تنقیح کی ہے، اس اعتبار سے فقہی ذخیرہ میں یہ قابل قدر مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔ اس کی مقبولیت میں کبھی کمی نہیں ہوئی بلکہ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

حوالہ جات

(۱) محمد سلمان منصور پوری، مفتی، فتاویٰ نویسی کے رہنما اصول، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ، ص ۶۷۔ (۲) فتاویٰ شامی مترجم، پیش لفظ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ج ۱، ص ۷۔۳۔ (۳) محمد تقی عثمانی، مفتی، میرے والد۔ میرے شیخ، ماہنامہ البلاغ، اشاعت خصوصی، کراچی، ۱۳۹۹ھ، ص ۴۲۰، ۴۲۱۔ (۴) محمد امین بن عمر بن عابدین، الشامی، ردالمحتار علی الدر المختار، مکتبہ زکریا، دیوبند، ۱۹۹۶ء، ج ۱، ص ۷۰۔ (۵) محمد امین بن عمر عابدین، الشامی، شرح عقود رسم المفتی، مکتبہ البشری، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۶۔ (۶) ابولبابہ شاہ منصور، مفتی، آداب فتاویٰ نویسی، الفلاح پبلشر، کراچی، صفر ۱۴۲۸ھ، ص ۱۰۶ تا ۱۰۹۔ (۷) نفس مصدر، ص ۱۱۵۔ (۸) نفس مصدر، ص ۱۱۸۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی کے باہمی مراسم

(مکاتیب گیلانی کے حوالے سے)

ڈاکٹر محمد اسماعیل اصلاحی ☆

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی (۱۸۹۲۔۱۹۵۶) کی ملازمت کا ابتدائی زمانہ تھا کہ مولانا سید عبدالباری ندویؒ (۱۸۹۰۔۱۹۷۶) عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ یہیں سے دونوں بزرگوں کے باہمی مراسم کا آغاز ہوا۔ لیکن ان کی پہلی ملاقات کب اور کیسے ہوئی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مولانا گیلانی کے سب سے قریب اور ان کی خلوتوں اور جلوتوں کے رازدار و امین تنہا مولانا عبدالباری تھے۔ مکاتیب گیلانی کے مقدمہ میں مولانا عبدالباری لکھتے ہیں:

> ''۳۳۔۳۴ سال اس دنیا میں ان سے دور ونزدیک کے تعلقات کی سعادت حاصل رہی۔ ان میں بھی قریباً چوتھائی صدی کی طویل و مسلسل قیام وطعام خلوت وجلوت، سفر وحضر، صحت ومرض وغیرہ کے ہر حال میں شب وروز کی یکجائی و رفاقت کی بدولت جس طرح جتنا موقع ان کے علمی وعملی، دینی ودنیوی، ظاہری وباطنی احوال کو قریب سے دیکھنے کا نصیب رہا، یقیناً اس خوش نصیبی میں کوئی دوسرا شریک نہیں''۔(۱)

خوش گوار تعلقات کی استواری اور متضاد طبیعتوں کے باوجود پائیدار دوستی کی ایک مثال ان دونوں بزرگوں کی کامیاب رفاقت تھی۔ مولانا عبدالباری کو جاننے والے ان کی شدت طبع اور سخت گیر

☆ شعبۂ دینیات سنی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

مزاج کا ذکر کرتے ہیں۔ مولانا علی میاں ندویؒ نے ''پرانے چراغ'' میں لکھا ہے:

> ''مولانا عبدالباری صاحب میں ایک حد تک شدت اور بے لچک پن تھا، وہ اپنے خلاف مزاج اور خلاف اصول کسی چیز کو برداشت نہیں کر سکتے تھے''۔ (۲)

پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی اور دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی لکھنؤ یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا عبدالباری کے مکان ہی میں رہائش پذیر تھے، اس لیے انہیں مولانا عبدالباری کے مزاج و معمولات سے واقفیت کا موقع ملا۔ وہ بھی اس تاثر میں شریک ہیں کہ ''مولانا عبدالباری بہت سخت مزاج تھے''، دوسری جانب مولانا گیلانی نرم خو اور ''ارنبی'' طبیعت کے انسان تھے۔ اسی وجہ سے مولانا عبدالباری نے انہیں ''خوش کرن'' کا خطاب دے رکھا تھا۔ (۳)

خود فراموشی مولانا گیلانی کی خاص پہچان تھی، سب کو خوش رکھنے کا جذبہ ایسا تھا کہ کسی کی ناخوشی کا تحمل ان کے بس کا نہ تھا۔ مولانا عبدالباری نے ان کی اس ''ارنبی'' طبیعت کے متعدد واقعات مکاتیب گیلانی کے مقدمہ اور خطوط گیلانی پر حواشی میں بیان فرمائے ہیں۔ ایک دفعہ مولانا عبدالباری اپنی طویل علالت کے سبب حیدرآباد کی اپنی رہائش گاہ مولانا گیلانی کے سپرد کر کے طویل رخصت پر لکھنؤ میں مقیم تھے کہ مولانا گیلانی کی نرم طبیعت کا فائدہ اٹھا کر کچھ لوگوں نے مولانا عبدالباری کے پورے مکان پر ہی قبضہ جما لیا۔ اس تعلق سے ان دونوں فاضلوں کے درمیان گلوں اور شکوؤں سے لبریز مکاتبت رہی۔ ایک خط کے جواب میں مولانا گیلانی نے عذر پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ''مکان بھر گیا ہے ایک واقعہ ہے۔ کسی کو نوٹس دینا میری ارنبی طبیعت کے لیے ناممکن ہے'' (۴)۔ اس جملہ کی وضاحت میں مولانا عبدالباری نے یوں حاشیہ آرائی فرمائی:

> ''ارنبی'' کیا مولاناؒ کی وہی غیر معمولی مروتی ''خوش کرنی'' طبیعت سے فائدہ اٹھا کر مکتوب الیہ کی علالتی طویل رخصت کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے پورے مکان پر اس طرح قبضہ جما لیا تھا کہ ایک کمرہ بھی نہ چھوڑا تھا جس میں مکتوب الیہ واپسی پر پناہ لے سکے۔ اسی ناگواری میں حقوق رفاقت کے بل پر کچھ ناگوار مکاتبت کی نوبت آگئی تھی''۔ (۵)

کچھ لوگوں نے ''گیلانی'' میں مولانا گیلانی کے آبائی مکان پر قبضہ کر لیا۔ اس کا تذکرہ کرتے

ہوئے انہوں نے ایک خط میں لکھا کہ ''گیلان میں کوئی نہ کوئی فتنہ پیدا ہو ہی جاتا ہے، یہ مسئلہ کہ میرے مکان پر ہر شخص دعویٰ کیوں کر دیتا ہے۔ اس کا نظارہ تو آپ نے حیدرآباد میں کیا'' (۶)۔ اس کی وضاحت میں مولانا عبدالباری نے حاشیہ تحریر فرمایا:

''جی ہاں مولانا کا خاص حال و مزاج یہی تھا۔ مکان کیا پلنگ پر بھی کوئی قبضہ کر لیتا تو اس کو ہٹانے کی ناراضگی نہیں گوارا فرما سکتے تھے۔ حج میں سفری پلنگ ساتھ تھا، اس پر کئی کئی کابلی لد کر بیٹھ جاتے تو خود اٹھ جاتے مگر شدید ناگواری کے باوجود ان کو کچھ نہ فرماتے''۔ (۷)

ایک دلچسپ واقعہ مولانا عبدالباری کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''ایک مرتبہ کسی معاملہ میں خود راقم نالائق کو شاید کچھ زیادہ ناخوش محسوس فرما کر تو غضب ہی فرما دیا کہ دھڑ سے پیروں پر گر پڑے، گھبرا کر ان کے سر کو اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور دونوں لپٹ کر خوب روئے''۔ (۸)

نباہ کرنے کی اس صلاحیت کا اعتراف مولانا ندوی نے اس طرح کیا:

''بالکل متضاد فطرت والے دن رات کے ساتھی راقم احقر کے ساتھ سالہا سال تک نہایت کامیاب ہی نہیں بڑا خوش گوار و دل نواز نباہ رہا۔ شاید دو چار بار سے زائد کسی کشیدگی و شکر رنجی کی نوبت نہ آئی ہو جس کا اثر دو چار دن کیا دو چار گھنٹے بھی رہا ہو یا ایک آدھ خط سے آگے بڑھا ہو''۔ (۹)

شکر رنجی کی نوبت کیا آتی، دونوں کے تعلقات میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا، دونوں کے احباب کا حلقہ بھی مشترک تھا، جو مولانا گیلانی کا دوست تھا، وہ مولانا ندوی کا بھی رفیق بن گیا اور جس کسی سے ملنا ہوتا تو دونوں ساتھ جاتے۔ پروفیسر ریاض الرحمان خاں شروانی اپنے دادا ''مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی اور مولانا عبدالباری کے باہمی مراسم'' کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خاکسار راقم الحروف کے پاس مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے خطوط خاصی تعداد میں محفوظ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں مولانا عبدالباری اور

مولانا مناظر احسن گیلانی میں بہت قرب رہا تھا۔مولانا عبدالباری نے لکھا ہے کہ ہم
دونوں شروانی صاحب کی خدمت میں ساتھ ساتھ حاضر ہوتے تھے‘‘۔(۱۰)

مولانا عبدالباری ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ’’وہ میرے ہم قیام وہم طعام ہی نہیں بلکہ دونوں کی رفاقت حیدرآباد میں ضرب المثل تھی‘‘(۱۱)۔مولانا علی میاں ندوی ۱۹۴۶ء میں ’’نزہۃ الخواطر‘‘ کی اشاعت کی غرض سے حیدرآباد تشریف لے گئے تو مولانا عبدالباری سبک دوش ہو چکے تھے۔اس لیے وہ ان دونوں فاضلوں کے گہرے مراسم کا مشاہدہ نہ کرسکے جس پر انھوں نے بہ انداز تاسف فرمایا:

’’افسوس ہے کہ میں اس ’’قران السعدین‘‘ کے منظر کو نہ دیکھ سکا، جو
دونوں فاضلوں اور ہم مذاق دوستوں کی یکجائی نے حیدرآباد میں پیدا کردیا تھا.....
اب بھی ان کا ذکر اوران کی یاد اس ماحول میں تازہ تھی اوران کے شاگرد وشرکائے
محفل مزے لے لے کراس زمانہ کے واقعات سناتے تھے‘‘۔(۱۲)

مولانا گیلانی ایک بار تشویش ناک حد تک صاحب فراش ہوگئے۔اس بیماری نے ان دونوں کے تعلقات کواور مستحکم کردیا۔مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

’’مولانا عبدالباری ندوی استاذ جامعہ اور فقیر کچھ دنوں سے ایک ہی مکان
میں رہنے لگے تھے۔ بیماری کے نازک دنوں میں مولانا نے زبانی ہی نہیں بلکہ عملی
ہمدردی بھی فرمائی۔واپسی کے بعدان ہی کے ساتھ قیام رہا کیونکہ تعلقات اس عرصہ
میں بہ نسبت پہلے کےاور زیادہ قریب ہو چکے تھے‘‘۔(۱۳)

مولانا گیلانی نے مولانا عبدالباری صاحب کے بچپن کے دوست مولانا عبدالماجد دریابادی سے اپنے تعلق کے آغاز وابتدااور بیماری کے زمانہ میں ان سے راہ ورسم میں مزید اضافہ کونعمت غیر مترقبہ سے تشبیہ دے کران دونوں بزرگوں سے اپنی دوستی کی بنیاد کوبھی واضح فرمایا ہے:

’’الغرض علالت کےاس دوران میں من جملہ دوسری نعمتوں کے ایک اس
غیر مترقبہ نعمت سے بھی سرفرازی ہوئی کہ مولانا عبدالماجداور مولانا عبدالباری ان
دونوں بزرگوں کے ساتھ روابط میں غیر معمولی استحکام واستواری پیدا ہوگئی اورامید
اسی کی ہے کہ ان بزرگوں کی ذرہ نوازیوں سے دنیا کے ساتھ ’’الآخرۃ‘‘میں بھی استفادہ

کا موقع انشاء اللہ عطا کیا جائے گا کہ ان رواسم وروابط کی بنیاد تقویٰ پر قائم ہے۔
ساری خلتیں جس دن عداوتوں سے بدل جائیں گی۔ الا المتقین کو اس عام قانون
سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے''۔(۱۴)

یہ دوستی جس کی بنیاد تقویٰ پر تھی اس میں مزید استحکام اس وقت پیدا ہوا جب مولانا گیلانی نے مولانا عبدالباری اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ساتھ سفر حج کا ارادہ کیا۔ دونوں بزرگوں کی دوستی کے باب میں سفر حج کا تذکرہ بہت اہم ہے اس لیے یہاں اس کی روداد مختصراً بیان کر دینا افادہ سے خالی نہیں۔

مولانا گیلانی گو خاندانی اعتبار سے صاحب حیثیت تھے اور جامعہ عثمانیہ کی ملازمت مالی لحاظ سے معقول تھی، لیکن جس وقت مولانا نے حج کرنے کا ارادہ کیا اس وقت ان کے حالات بہت نازک تھے۔ جسمانی طور پر بیماریوں نے کمزور کر دیا تھا، پھر ملازمت سے طویل رخصت کی وجہ سے تنخواہ بھی نصف ملتی تھی، علاج معالجہ میں خرچ نے قرض سے گراں بار کر دیا تھا لیکن اسی دوران مولانا عبدالباری نے سفر حج کا ارادہ ظاہر کیا اور اس کے لیے تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی بھی مولانا عبدالباری کے ساتھ سفر حج پر روانہ ہونے والے تھے۔ اپنے دونوں قریبی دوستوں کو حج کے سفر کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر مولانا گیلانی کو بھی شدید خواہش ہوئی کہ ان دوستوں کے ساتھ وہ بھی حج کا فریضہ ادا کریں۔ روانگی میں محض دو ہفتے باقی رہ گئے تھے تاہم سفر حج کی تمام کارروائیاں پوری ہوئیں اور تینوں دوستوں کا قافلہ مع متعلقین عازم مکہ ہوا۔ یہ قافلہ کل اکیس افراد پر مشتمل تھا جس میں مولانا عبدالباری کے والدین بھی شریک تھے۔ یہ قافلہ مختلف خیموں میں تقسیم ہو گیا۔ حسن اتفاق کہ مولانا گیلانی کی رہائش اسی رباط میں تھی جہاں مولانا عبدالماجد، مولانا عبدالباری اور ان کے والدین مقیم تھے اور ان کے کھانے کا نظم بھی مشترک تھا(۱۵)۔ اس طرح مولانا گیلانی اور مولانا عبدالباری کی یہ دوستی گھریلو تعلقات میں تبدیل ہونے لگی۔ مکاتیب گیلانی میں مولانا منت اللہ رحمانی نے مولانا عبدالباری کے نام جو سب سے پہلا خط مندرج فرمایا ہے، وہ ۲۳ر مئی ۱۹۲۸ء کا ہے اور ان کے حج کا سال ۱۹۲۹ء ہے۔ حج سے پہلے کے خطوط میں ذاتی مصروفیات کا تذکرہ اور علمی گفتگو زیادہ ہوتی تھی، جبکہ حج کے بعد کے خطوط میں گھریلو تعلقات کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ مولانا عبدالباری کی اہلیہ کو سلام

پیش کرتے وقت انداز کچھ شوخ ہوجاتا تھا۔کبھی سیدانی اور کبھی اہل بیت کہہ کر سلام عرض کرتے تو کبھی ’’اہلیہ صائمہ کو سلام‘‘(۱۶) جیسے الفاظ استعمال کرتے تھے۔

دونوں دوستوں کے گھریلو مراسم اس قدر گہرے ہوگئے تھے کہ مولانا گیلانی نے جب اپنے فرزندارجمند محی الدین کا عقد مسنون کیا اور موسم کی غیر معمولی سختی کے سبب مولانا عبدالباری کے گھر والوں کو سفر کی مشکلات کے پیش نظر اس میں شامل ہونے کی زحمت سے محفوظ رکھا تو مولانا عبدالباری کی والدہ نے اس کی شکایت کی جس کو مولانا عبدالباری نے اپنے ایک خط میں رقم فرمایا ہے۔اس کے جواب میں مولانا گیلانی نے یوں معذرت پیش کی:

’’اسی کارڈ میں والدہ ماجدہ مدظلہا کے اس مشفقانہ گلہ کے متعلق بھی عرض کیا تھا کہ محی الدین کی شادی میں دعوت ان کو کیوں نہ دی گئی۔واقعہ یہ ہے کہ دعوت دینا تو میرا فرض تھا گو اس دعوت کا قبول کرنا محترمہ مدظلہا کے لیے سخت صعوبت کا باعث ہوتا اس جہنمی گرمی میں جب فیح جہنم سے عالم معمور ہے گھر سے نوجوانوں کا قدم نکالنا مشکل ہے چہ جائے کہ ان جیسی ضعیفہ کا۔بہرحال ان کی یہ شفقت میرے لیے ان کی شرکت کی مسرت سے زیادہ ہے۔امیدوار رہتا ہوں کہ اوقات خاص میں اپنی مخلصانہ دعاؤں میں مجھے فراموش نہ فرمائیں گی‘‘۔(۱۷)

گھریلو تعلقات کا عالم یہ تھا کہ مولانا عبدالباری کی بڑی بیٹی کا نام مولانا گیلانی نے ہی صبیحۃ الباری رکھا تھا(۱۸)۔اسی طرح ان کے مکان کا نام ’’شبستان سعادت‘‘ مولانا گیلانی کا ہی تجویز کردہ ہے۔(۱۹)

مولانا گیلانی بیماری کے زمانے میں کئی مہینے مولانا عبدالباری کے اسی مکان ’’شبستان سعادت‘‘ میں مقیم رہے۔اس وقت مولانا عبدالباری حیدرآباد میں تھے۔مولانا گیلانی نے ان کو یہاں سے کئی خط لکھے جن میں اپنی بیماری اور علاج کے علاوہ شبستان سعادت کا بہت شاندار نقشہ کھینچا ہے:

’’شعیب سلمہ مجھے اس مکان میں لے آئے،جس میں آنے کے بعد صرف جنت جانے کا شوق رہ جاتا ہے ورنہ زمین کے چہرے پر اتنی خوبیوں اور ماحول کی زیبائیوں کے ساتھ اس سکون کی جگہ ملنی دشوار ہے.....،اس کی فضائیت اور خوش گوار

کیفیت کا مقابلہ کون کرسکتا ہے .....اتنا لطف کبھی نہیں ملا جو اس مکان میں پا رہا ہوں.....،شعیب سلمہ تو ڈاکٹر صاحب وغیرہ کے پاس آٹھ نو بجے چلے جاتے ہیں اور بندہ درگاہ ایک خاص قسم کے خلوت میں مغربی حصہ کے بالا خانے کے اندرونی کمرے اور برساتی کی چھت پر ایک خاص حال میں بسر کرتا ہے .....آپ کے مکان میں آئے ہوئے تین دن کامل ہو چکے ہیں آج چوتھا دن ہے''۔(۲۰)

مولانا گیلانی اور مولانا عبدالباری کے باہمی مراسم کا تذکرہ ''آم'' اور ''خربوزہ'' کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔دونوں کو یہ پھل بہت مرغوب تھے، بیشتر خطوط میں کسی نہ کسی عنوان سے ان کا ذکر ہے۔اس تعلق سے ایک خط کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

''آموں کے نسخے کے متعلق برادرم مکارم آپ کو مستقل جواب دیں گے۔کہیے خربوزوں کا کیا حال ہے۔پچھیا خوب چل رہی ہے''۔(۲۱)

مولانا سید سلیمان ندوی کے دستر خوان تک مولانا عبدالباری کا خربوزہ پہنچ گیا، اسکا بیان کس لذت سے کیا گیا:

''جس دن آپ کا گرامی نامہ ملا کہ پارسل روانہ ہو چکا ہے ٹھیک اسی وقت ہمارا پورا گھرا اپنے ایک خاص عزیز کی تقریب میں شرکت کے لیے دسنہ جا رہا تھا ......آدمی شیخ پورہ جائے اور پارسل چھڑا لے اور .....اسی وقت اس کو دسنہ روانہ کرے۔یہی کیا گیا، ہم لوگ دسنہ چل دیے۔دوسرے دن دو بجے کے قریب ٹوکرا وہیں پہنچا۔کیا یہ عجب نہیں ہے کہ مولانا عبدالباری صاحب کا بھیجا ہوا خربوزہ مولانا سید سلیمان صاحب کی میز کی زینت بنا۔تصور سے کیا بالاتر یہ واقعہ نہیں ہے۔بہرحال اس خوف سے کہ ضائع ہو جائے گا دسنہ میں احباب کو تقسیم کیا گیا۔میاں مکارم کے لیے یہی فضیلت کافی تھی کہ لکھنؤ خاص سے ان کے نام خربوزہ آتا ہے''۔(۲۲)

مولانا عبدالباری کو شکر کی بیماری تھی۔تسلی آمیز جملوں کے بعد لکھا کہ ''اللہ تعالیٰ شفا عطا فرمائے گا۔باقی آموں کا کیا ہوگا۔کیا آموں کی شیرینی بھی ممنوع ہے''؟(۲۳)

مولانا گیلانی حیدرآباد میں مولانا عبدالباری سے چند سال پہلے آ گئے تھے۔ان کے قیام

کے آخری سالوں میں مولانا گیلانی کی محبت کے ساتھ ان کے دینی زندگی کے عروج کا اعتراف بھی بڑھ گیا، جیسا کہ ۱۹۴۳ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا عبدالباری کا حال تو حدود رشک سے بھی آگے نکل گیا، اب میرے نزدیک تو وہ اچھے خاصے صاحب دل بزرگ ہیں''۔(۲۴)

مولانا عبدالباری مولانا گیلانی سے دو سال بڑے تھے اس لیے وہ مولانا گیلانی سے پہلے ستمبر ۱۹۴۵ء میں وظیفہ یاب ہوکر لکھنؤ لوٹ آئے۔ اس دوری کا شکوہ مولانا گیلانی نے علامہ سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط میں کچھ اس طرح کیا ہے:

''اور حالات کیا لکھوں، اس کا تو علم ہو ہی چکا ہوگا کہ مولانا عبدالباری کی چوبیس سالہ رفاقت آخر اس فقیر کے ساتھ ختم ہوگئی''۔(۲۵)

جنوری ۱۹۴۶ء میں مولانا عبدالباری کے نام ایک خط میں ان کی والدہ کی خدمت میں سلام پیش کرتے ہوئے درخواست گزار ہیں:

''اپنی والدہ کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کرتے ہوئے دعا کی بھی درخواست دیجیے۔ اب دل بہت گھبراتا ہے اس لیے زیادہ گھبراتا ہے کہ دکن سے وطن تک ایک آدمی بھی اب ایسا کوئی باقی نہ رہا جس سے میں گفتگو کرکے اپنے دل کی کم از کم بھڑاس نکالوں اور نہ کوئی ایسا ہے جس سے کچھ سن کر سکینت قلب حاصل کروں۔ ایسی تنہائی محسوس کررہا ہوں گویا دنیا میں تنہا پیدا کیا گیا ہوں۔ گویا اگر میں آدمی ہوں تو دوسرے آدمی نہیں ہیں اور وہ آدمی ہیں تو میں جانور ہوں''۔(۲۶)

مولانا گیلانی بھی ۱۹۴۹ء میں مستقل طور سے گیلان آگئے۔ مکاتبت کا خوش گوار سلسلہ قائم رہا، مگر جب مولانا عبدالباری کی کتاب ''تجدید معاشیات'' منظر عام پر آئی تو مولانا گیلانی نے اس کو اپنی کتاب ''اسلامی معاشیات'' کا جواب سمجھا۔ ''اسلامی معاشیات'' میں اس بات پر خاص توجہ دی گئی کہ دولت کو کس طرح سے حاصل کیا جائے۔ جبکہ مولانا عبدالباری نے انفاق پر زور دیا اور یہ واضح کیا کہ ایک مسلمان کے پیش نظر دولت کا حصول نہیں بلکہ انفاق کا جذبہ ہونا چاہیے۔ پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ''تجدید معاشیات'' کا تعارف وتجزیہ پیش کیا ہے۔ اس میں

وہ مولانا عبدالباری کی رائے کی حمایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’مصنف ممدوح نے کتاب کے دیباچہ میں اسلامی معاشیات کا امتیازی نکتہ واضح کر دیا کہ اس کی بنیاد ’’کسب معاش یا پیدائش دولت کے بجائے استعمال دولت یا انفاق پر ہے اور یہی تمام معاشی مسائل و مشکلات کا اصولی و قرآنی بے خطا حل ہے‘‘۔ حقیقت یہ کہ قرآن کریم کے مطالعہ سے ناچیز کے سامنے بھی یہی نکتہ اُبھر کر سامنے آتا ہے، اس لیے کہ زیادہ زور انفاق یا مال خرچ کرنے اور اس میں دوسروں کے حقوق ادا کرنے پر دیا گیا ہے۔ مولانا نے اسلامی معاشیات کے اسی نکتہ کو مختلف ابواب میں نمایاں کیا ہے‘‘۔ (۲۷)

مولانا گیلانی کے لیے یہ اختلاف نظر آزردگی کا سبب بن گیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا کہ مولانا گیلانی اپنی فطری لینت و نرمی کے سبب دینی مسائل کی توضیح و تشریح میں بھی **کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم** پر عمل کرتے جب کہ ان کے رفیق کار اور یار غار غالباً اپنی سخت مزاجی کے سبب برسوں یونیورسٹی میں فلسفہ کا درس دینے کے بعد بھی تحریر و تقریر میں کسی قسم کے لوچ یا اسلوب استدلال میں نرمی کے قائل نہ تھے۔ اس کا اثر ان دونوں کی تحریروں میں نمایاں ہوا، لیکن اس میں فرق اس وقت ظاہر ہوا جب ایک مشترک موضوع یعنی اسلامی معاشیات کے تعلق سے دونوں دوستوں کی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں:

> ’’مولانا گیلانی کی کتاب ’’اسلامی معاشیات‘‘ پہلے طرز فکر اور طرز تحریر کا نمونہ ہے اور مولانا عبدالباری کی کتاب ’’تجدید معاشیات‘‘ دوسرے طرز فکر اور طرز تحریر کا، جب وہ شایع ہوئی تو شاید مولانا گیلانی کو محسوس ہوا کہ وہ ان کی کتاب کا جواب ہے، شاید اس سلسلہ میں دونوں مخلص دوستوں اور دیرینہ رفیقوں میں کچھ مراسلت بھی ہوئی اور ہر ایک نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا‘‘۔ (۲۸)

اس قسم کی مراسلت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ غالباً اسی لیے مولانا علی میاں نے بھی ’’شاید‘‘ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی لیے مولانا علی میاں نے یہ لکھا کہ ’’مجھے اس کی اطلاع نہیں‘‘ تاہم انھوں نے اپنے نام مولانا گیلانی کے ایک خط کے ذریعہ اس کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

"(تھانوی المذاق ندوی القلم) بزرگ کا معتوب بنا ہوا ہوں کہ ان کی تازہ کتاب "تجدید معاشیات" کو اپنی کتاب "اسلامی معاشیات" کا تعریضی جواب خاکسار نے خیال کرلیا، خاکسار نے بھی اور ان کے دوست "صاحب صدق" نے بھی، مقصد میں ہم دونوں متحد ہیں لیکن پانی مانگنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پن بھرن سے کہا جائے ماں! ذرا پانی پلا دے، لیکن ماں! کی جگہ کچھ دوسرے الفاظ **دالة علی الاموۃ** کا ذکر کیا جائے تو یقیناً اثر بدل جائے گا، حضرت تھانوی ہی سے یہ اظروفہ سنا تھا بہرحال حکم "**فاصدع بما تومر**" کا بھی ہے اور **ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ** کا بھی ہے، مکلفین کے اختیار تمیزی کی یہ بات ہے کہ وقت کس کا ہے؟ ۲۷ر دسمبر ۱۹۵۵ء"۔(۲۹)

۵ر جون ۱۹۵۶ء میں جب مولانا گیلانی کا انتقال ہوا تو مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "سچ اور صدق" نے متعدد تعزیتی تحریریں شائع کیں۔ مولانا عبدالباری نے اپنے رفیق کار اور یار غار کے گزر جانے پر مختصر وطویل کئی مضامین صدق میں شائع کرائے۔ ان کی ایک مختصر تحریر مدیر صدق نے "کام کی بات" کے عنوان سے اپنے ادارتی نوٹ کے ساتھ مولانا گیلانی کے انتقال کے چند دنوں بعد شایع کی۔ خاص بات یہ کہ اس مختصر سی تحریر مین مدیر صدق جدید نے دو ادارتی نوٹ لگائے ہیں ایک شروع میں اور دوسرا آخر میں۔ پہلا یہ بتانے کے لیے کہ یہ تحریر مولانا عبدالباری کا تعزیت نامہ ہے اور دوسرا اس تعزیت نامہ پر بطور حاشیہ۔ اب صدق کی فائلیں عام لوگوں کی دسترس میں نہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالباری کا مکمل تعزیت نامہ مع مکمل حواشی یہاں پیش کردیا جائے:

"کام کی بات۔ محقق گیلانی کے مخلص اور رفیق خصوصی مولانا عبدالباری ندوی کا تعزیت نامہ:

ادھر عرصہ سے مولانا گیلانی کے گرامی نامے اپنی زندگی سے مایوسی ہی کے ہوتے تھے۔ لیکن میرا دل ان کی زندگی کی تمنا سے مغلوب اور صحت وشفا کا روزانہ دعا گو، طویل بے ہوشی کی خبر کے بعد بھی برابر پر امید ہی رہا کہ میاں مکارم سلمہ کے تار نے اچانک مولانا ہی کی سچائی کی خبر سنائی، **انا للہ وانا الیہ راجعون**۔

کون کس کی تعزیت کرے، حادثہ کسی ایک گھر گھرانے کا نہیں، کسی خاص
بستی اور آبادی کا نہیں دل و دماغ علم و قلم کے گونا گوں فضائل و کمالات کے جامع
ملت اسلامیہ کے ایک سپوت کا ہے اور ہر فرد ملت بجائے خود تعزیت کا محتاج۔
دور و نزدیک سینکڑوں ہزاروں شاگرد و معتقد علاوہ خاص اعزہ و احباب کے
پھیلے ہوئے ہیں اس رسمی تعزیت بازیوں کے دور میں خصوصیت کے ساتھ درخواست
ہے کہ صدق کے ذریعہ متوجہ کرائیں کہ سب پر سب سے مقدم حضرت مرحوم کے حق
میں دعائے مغفرت کے ساتھ رفع درجات اور اپنی اپنی حیثیت و اہمیت کے موافق
صدقات مالیہ سے خصوصاً ایصال ثواب کا ہے، لوگ اس کا خیال کم ہی کرتے ہیں۔ **اللّٰھم
اغفر له وارحمه ورفع درجاته وصلی اللہ علی محمد وآله وسلم۔**
بیشک مولانا نے جس طرف توجہ دلائی ہے وہ کام ہی کی بات ہے لیکن اسی
دایرۂ ایصال اجر میں حضرت مرحوم کی کئی دینی کتابوں اور مقالوں کی اشاعت بھی
پوری طرح آجاتی ہے۔ خصوصاً الدین القیم، النبی الخاتم، تدوین حدیث وغیرہ مخلصین
کو ادھر بھی توجہ رکھنا چاہیے''۔ (۳۰)

مولانا گیلانی کی وفات کے کچھ دنوں بعد مولانا عبدالباری نے اگست ۱۹۵۶ء میں ''یادگار گیلانی'' کے عنوان سے ایک وقیع مضمون تحریر فرمایا جو صدق میں قسط وار شایع ہوا۔ اس میں انہوں نے مولانا گیلانی کے اوصاف و کمالات کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ ان گنے چنے افراد میں فرد فرید کا مقام رکھتے
تھے۔ بلکہ بقول ''صاحب صدق'' ہر بڑے سے بڑے ندوی سے بڑھ کر تھے اور
ان کی اس ذہنی و وہبی ندویت کے لیے واہب العطایا جل مجدہ نے عثمانیہ یونیورسٹی کا
میدان بھی خوب ہی عطا فرمایا تھا''۔ (۳۱)

آگے عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالحکیم کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

''عثمانیہ یونیورسٹی کا اسٹیج معلوم ہوتا ہے کہ کھولا ہی بعض خاص افراد کے
لیے گیا تھا۔ جن کے ریٹائر ہونے کے کچھ ہی آگے پیچھے ''پولیس کارروائی'' میں

ڈراپ سین کردیا گیا''۔(۳۲)

مولانا گیلانی نے خود بھی یہی بات بہت صاف لفظوں میں بیان کی ہے:

''غالباً حیدرآباد کی ہی نوکری کے لیے پیدا ہوا تھا اور یہی کام کرکے مجھے دنیا سے جانا ہے''۔(۳۳)

اپنے اس طویل مضمون میں مولانا عبدالباری نے مولانا گیلانی کے زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ان کی زندگی کا اصل مقصد عصری علوم سے بہرہ ور مگر دینی علوم سے ناواقف مسلم نوجوانوں کی اصلاح اور ان کی تربیت تھا:

''غرض یہ دعویٰ مبالغہ نہ ہوگا کہ مولانا گیلانی کی زندگی کا تحریر و تقریری بڑا مشن اپنے ان نئے بھکے ہوئے بھائیوں کی دستگیری تھی۔نجی طور پر کوئی چھوٹا بڑا ان بھائیوں میں سے سامنے آجاتا تو اپنے اس حریصانہ مشن کا زور پورے جوش سے لگانے لگتے''۔(۳۴)

مولانا گیلانی کا خیال یہ تھا کہ تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کی تربیت کے لیے اسلامک ہاسٹل قائم کیے جائیں جن کے ذریعہ عصری اداروں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی اصلاح وتربیت کا فریضہ انجام دیا جائے،مولانا عبدالباری نے اپنے اس طویل مضمون میں اصل زور مولانا گیلانی کے اسی تصور پر صرف کیا، مکاتیب گیلانی کے مبسوط مقدمہ میں بھی انہوں اس پر بہت زور دیا ہے اور یہ کہا کہ مولانا گیلانی چونکہ عملی آدمی نہیں تھے،نہ ہی ان کے اندر یہ قوت وصلاحیت تھی کہ وہ اپنے افکار کو عملی شکل میں پیش کرسکیں،اس لیے یہ ذمہ داری ان سے تعلق رکھنے والے محبین ومنتسبین کی ہے کہ وہ اس کو عملی جامہ پہنائیں۔

مذکورہ تفصیلات سے اس بات کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا مختصر سے مختصر سوانحی خاکہ یا ان کی حیات وخدمات کا احاطہ مولانا عبدالباری کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گا۔مولانا عبدالباری نے مختلف مضامین اور مکاتیب گیلانی کے ذریعہ مولانا گیلانی کی حیات وخدمات کے تعلق سے جو معلومات فراہم کی ہیں۔ان کے افکار ونظریات کی جتنی اور جیسی تشریح انہوں نے کی ہے اس سے صرف نظر کرنا ان کے کسی بھی سوانح نگار کے لیے ممکن نہیں ہے۔مولانا گیلانی کی حیات وخدمات کے تعلق سے دو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ایک مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب

کی مرتب کردہ ہے۔ یہ ''حیات مولانا گیلانیؒ'' کے نام سے مبسوط اور طویل ہے۔ دوسری ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کی ''مولانا سید مناظر احسن گیلانی شخصیت اور سوانح'' کے نام سے قدرے مختصر ہے۔ لیکن ان دونوں کتابوں میں مولانا گیلانی کے یار غار کا تذکرہ برسبیل تذکرہ ہی ہوا ہے۔ مولانا گیلانی اور مولانا عبدالباری کے باہمی مراسم اس قدر گونا گوں تھے اور اس حوالے سے اتنا مواد بھی دستیاب ہے کہ ایک مکمل کتاب مرتب کی جاسکتی ہے۔

حوالہ جات

(۱) مولانا منت اللہ رحمانی، مکاتیب گیلانی، ج ۱، دارالاشاعت رحمانی، خانقاہ مونگیر، ۱۹۷۲ء، ص ۴۲۔ (۲) مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، پرانے چراغ، مکتبۃ الشباب العلمیہ ندوہ روڈ لکھنؤ۔ ۲۰، ۲۰۱۰ء، ۲/ ۱۱۲۔ (۳) مکاتیب گیلانی، ۱/ ۱۴۷ (حاشیہ)۔ (۴) ایضاً، ۱/ ۱۹۰۔ (۵) ایضاً، ۱/ ۱۹۰ (حاشیہ)۔ (۶) ایضاً، ۱/ ۱۶۶۔ (۷) ایضاً، ۱/ ۱۶۶ (حاشیہ)۔ (۸) ایضاً، ۱/ ۴۴۔ (۹) ایضاً، ۱/ ۴۵۔ (۱۰) محمد وثیق ندوی، مولانا عبدالباری ندویؒ شخصیت اور علمی خدمات، مولانا عبدالباری ندوی ایجوکیشنل سوسائٹی، لکھنؤ، ۲۰۱۶ء، ص ۶۳۔ (۱۱) تعمیر حیات، فروری ۱۹۷۶ء، بحوالہ حیات عبدالباریؒ، سید محمود حسنی ندوی، مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۲۰۰۹ء، ص ۹۳۔ (۱۲) پرانے چراغ، ۲/ ۱۰۷۔ (۱۳) مولانا سید مناظر احسن گیلانی، دربار نبوت کی حاضری، الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد لکھنؤ، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۔ ۱۹۔ (۱۴) دربار نبوت کی حاضری، ص ۲۰۔ (۱۵) دربار نبوت کی حاضری، ص ۷۳۔ ۹۷۔ (۱۶) مکاتیب گیلانی، ۱/ ۱۵۵۔ (۱۷) ایضاً، ۱/ ۲۳۳۔ (۱۸) ایضاً، ۱/ ۱۵۵ (حاشیہ)۔ (۱۹) ایضاً، ۱/ ۱۴۸ (حاشیہ)۔ (۲۰) ایضاً، ۱/ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ (۲۱) ایضاً، ۱/ ۲۰۸۔ (۲۲) ایضاً، ۱/ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ (۲۳) ایضاً، ۱/ ۲۱۱۔ (۲۴) ایضاً، ۱/ ۳۳۰۔ (۲۵) ایضاً، ۱/ ۲۸۱۔ (۲۶) ایضاً، ۱/ ۲۵۲۔ (۲۷) مولانا عبدالباری ندویؒ شخصیت اور علمی خدمات، ص ۱۰۹۔ (۲۸) پرانے چراغ، ۱/ ۲۷۔ (۲۹) ایضاً، ۱/ ۲۳۔ (۳۰) صدق، لکھنؤ، مدیر مولانا عبدالماجد دریابادی، ۲۲؍ جون ۱۹۵۶ء، ص ۲۔ (۳۱) ایضاً، ۲۴؍ اگست ۱۹۵۶ء، ص ۶۔ (۳۲) ایضاً۔ (۳۳) مکاتیب گیلانی، ص ۱۳۴۔ (۳۴) صدق، لکھنؤ، ۲۴؍ اگست ۱۹۵۶ء، ص ۷۔

اخبار علمیہ

’’قرآن مجید کا پتھروں پر نقش کرنا‘‘

سعودی عرب کے حسان العنیزی نے ماربل کی ۳۰ سلوں پر قرآن مجید کے تیس پاروں کو نقش کرنے میں آٹھ برس اس امید پر صرف کیے ہیں کہ ان کا نام گنیز بک آف ورلڈ میں درج کیا جائے گا۔ بیس برس قبل انھوں نے یہ عزم کر لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے عربی زبان لکھنے میں مہارت پیدا کی۔ سعودی عرب کے جنوب مغرب میں واقع تبوک سے ان کا تعلق ہے۔ اس علاقہ میں بہت سی عمارتیں اور محل ہیں جن پر صدیوں پہلے کے ماہر خطاطوں کے نمونے موجود ہیں۔ جن کو دیکھ کر انہیں حوصلہ ملا۔ انھوں نے اس کے لیے عہد عثمانی کی خطاطی کا استعمال کیا ہے اور قرآن کے سر آغاز بسملہ سے اس کی ابتدا کی ہے۔ عنیزی نے گرینائیڈ اور تراشیدہ پتھروں کے ان ٹکڑوں کا استعمال کیا ہے جو بطور خاص تبوک کے علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ (ینگ مسلم ڈائجسٹ، اگست ۲۰۲۱ء، ص ۳۵)

’’امیر خسرو پر امارات کے عربی مجلہ میں ایک مقالہ‘‘

آفاق الثقافۃ والتراث نام سے ایک نہایت علمی و تحقیقی سہ ماہی مجلہ امارات سے تقریباً تیس برس سے شائع ہو رہا ہے۔ اپنے اعلیٰ معیار کے سبب اس رسالہ کو عالم عرب بالخصوص امارات میں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ یہ اصل میں مرکز جمعۃ الماجد، امارات کا آرگن ہے۔ اس کے سرورق کی پشت پر رسالہ میں مقالہ کی اشاعت کی دس اہم شرائط درج ہیں۔ بعض مندرجات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ متعلقہ موضوع کے ماہرین سے چک کرانے کے بعد اشاعت کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس کے موجودہ ایڈیٹر ڈاکٹر عزالدین بن زغیبہ ہیں۔ اس مجلہ کا ۱۱۴واں عدد (جولائی ۲۱ء) ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے اہم اور قابل قدر مقالات میں ایک عمدہ مقالہ ’’**ببغاء الهند الشاعر امیر خسرو و مکانته فی الادب العربی**‘‘ کے عنوان سے ہے۔ مقالہ نگار ڈاکٹر محمد علی الوافی، کرواتل ہیں۔ ان کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ مقالہ نگار نے طوطی ہند امیر خسرو اور عربی ادب میں ان کے مقام و مرتبہ پر بڑی مدلل اور محققانہ گفتگو کی ہے۔ اسلوب عالمانہ اختیار کیا ہے۔ پیش نظر ماخذ میں امیر خسرو پر اردو، فارسی اور انگریزی میں شائع شدہ کتابیں اور مقالات ہیں۔ مقالہ میں سب سے پہلے حوالہ کے طور پر

علامہ شبلی کا نام نظر آیا۔ مقالہ نگار نے خسرو کے متعلق علامہ شبلی کے ایک قول کا عربی ترجمہ اس طرح کیا ہے "ذکر العلامہ شبلی النعمانی انه لم یلد الزمان بمثله فی الهند منذ ستة قرن ولم ینبغ مثله من تربة الایران والروم الا القلائل"۔ قارئین معارف بالخصوص شیدایان خسرو کے لیے یہ اطلاع اس لیے اہم اور ضروری ہے کہ انہیں پتہ چلے کہ ان کے ممدوح کی ادبی و شعری عظمت و منزلت کا دائرہ اردو و فارسی زبان تک محدود نہیں ہے۔ ان کے فکر و فن کے قدرداں عجم کے ساتھ ساتھ عرب بھی ہیں۔

"کرسٹ ویسٹر گارڈ کی عبرت ناک موت"

کرسٹ ویسٹر گارڈ، ڈنمارک کا ایک صحافی اور کارٹونسٹ تھا۔ ۱۹۸۰ء میں ڈنمارک کے اخبار زی سینڈ بوسٹین سے وابستہ ہوا اور مختلف قسم کے خاکے اور کارٹون بنا کر شہرت حاصل کی۔ تقریباً ۱۶/۱۷ برس قبل ۲۰۰۵ء میں اس نے پہلی بار حضور پاک ﷺ کا فرضی خاکہ بنا کر اسی اخبار میں شائع کرا دیا۔ اس نے ۱۲ بے بنیاد اور فرضی کارٹون بنائے تھے۔ اس کی اس مذموم حرکت سے پوری دنیا بالخصوص عالم اسلام میں اس کے خلاف مسلمانوں کا غصہ پھوٹ پڑا تھا۔ ان کے جذبات مشتعل اور وہ سراپا احتجاج ہو گئے تھے۔ خود ڈنمارک میں فرقہ وارانہ فساد بھڑک اٹھا تھا اور یہ سلسلہ اس قدر طول پکڑ گیا تھا کہ فروری ۲۰۰۶ء میں بے قابو بھیڑ نے ڈنمارک کی سڑک پر خون خرابہ کیا تھا۔ اس میں تقریباً ۱۲ جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ بعض مسلم ملکوں میں ڈنمارک اور ناروے کے سفارت خانوں پر حملے بھی ہوئے تھے، بعد میں ڈنمارک پولیس نے اس ملعون کو تحفظ فراہم کیا۔ گذشتہ دنوں خبر آئی کہ جولائی کے آخری ہفتہ میں ۸۶/ برس کی عمر پوری کر کے اب وہ خدا کے حضور حاضر ہو گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ادھر چند برسوں سے وہ کسی لاعلاج بیماری کا شکار ہو کر گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ڈینش اخبار "برلنگسکے" نے اس کی عبرت ناک موت کی تصدیق کی ہے۔ (اداریہ، پندار پٹنہ، ۳۰/جولائی ۲۰۲۱ء، ص ۶)

"اسرائیل میں اسباب سوزش قلب کی تحقیقات"

اسرائیل میں دسمبر ۲۰۲۰ء سے مئی ۲۰۲۱ء کے درمیان ۲۷۵ افراد بالخصوص نوجوانوں کو ورم

وسوزش قلب (مائیوکارڈائیٹس) کی شکایات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسرائیلی ماہرین صحت اس کو فائزر کے تیار کردہ کورونا وائرس کے ٹیکہ سے مربوط کر کے دیکھ رہے ہیں کہ کہیں لوگ اس ٹیکہ کے سبب تو اس بیماری کا شکار نہیں ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اسرائیلی محکمۂ صحت نے اس بیماری کی وجوہات کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کا فیصلہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ اسرائیل میں ۵۰ لاکھ افراد کو ویڈ ویکسین کا ٹیکہ لگا چکے ہیں، جن میں ۲۷۵ افراد میں قلبی ورم وسوزش کی علامات پائی گئی ہیں۔ حالانکہ فائزر کے ذمہ داروں کا کہنا ہے کہ انہیں ٹیکہ لگوانے والوں میں یہ علامات نظر نہیں آئیں اس لیے اس مرض کو فائزر کے ٹیکہ سے جوڑ کر دیکھنا مناسب نہیں ہے۔ (احمد ٹائمز، حیدرآباد، اگست ۲۰۲۱ء، ص ۳۱)

''اردو دس بڑی زبانوں میں شامل''

ایک عالمی تحقیق کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی ۲۵ زبانوں میں انگریزی اول اور اردو دسویں نمبر پر ہے۔ دوسرے مقام پر ہندی، تیسرے پر مینڈرین چائنیز، چوتھے پر ہسپانوی، پانچویں پر اسٹینڈرڈ عربی ہے۔ عربی کی یہ قسم مشرق وسطی اور افریقہ کے پچیس ملکوں کے تقریباً ساڑھے ۲۷ کروڑ لوگ بولتے ہیں۔ چھٹے پر بنگالی جن کے بولنے والوں کی تعداد ۲۶ کروڑ ۸۰ لاکھ، ساتویں پر فرانسیسی، ۲۶ کروڑ ۷۰ لاکھ، آٹھویں پر روسی، ۲۵ کروڑ ۸۰ لاکھ، نویں پر پرتگالی، ۲۵ کروڑ ۸۰ لاکھ اور دسویں پر اردو ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد ۲۳ کروڑ ہے۔ ۱۹ کروڑ ۸۰ لاکھ افراد انڈونیشی، ساڑھے تیرہ کروڑ جرمن، ۱۲ کروڑ ۶۰ لاکھ جاپانی، ۹ کروڑ نوے لاکھ مرہٹی، نو کروڑ ۶۰ لاکھ تیلگو، آٹھ کروڑ ۸۰ لاکھ ترکی، ساڑھے آٹھ کروڑ تمل، ساڑھے آٹھ کروڑ یوئی چائنیز، آٹھ کروڑ ۲۰ لاکھ ودھ چائنیز، آٹھ کروڑ بیس لاکھ کورین، ۷ کروڑ ۷۰ لاکھ ویت نامی، ۷ کروڑ ۵۰ لاکھ نائیجیریا میں ہاؤسا، ۷ کروڑ ۷۰ لاکھ فارسی، ۷ کروڑ مصری عربی، چھ کروڑ ۹۰ لاکھ افراد مشرقی افریقہ میں سواحلی زبان بولتے ہیں جو بالترتیب گیارہویں سے پچیسویں مقام پر ہیں۔ جو لوگ اردو کو اپنی علمی، تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں غیر اہم اور اس کا مستقبل تاریک سمجھ کر اس کی جانب توجہ نہیں دیتے انہیں اپنی خام خیالی پر غور کرنا چاہیے۔ (تاثیر، پٹنہ، ۱۵؍اگست ۲۰۲۱ء، ص ۱۳)

ک، ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

پاکستان اور ایران سے چند جدید علمی مطبوعات ۔۸

ڈاکٹر عارف نوشاہی☆

سلسلۂ نوشاہیہ کا اہم ماخذ ثواقب المناقب: سلسلۂ قادریہ نوشاہیہ کے تمام بنیادی مآخذ فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ان میں ایک کتاب ثواقب المناقب بھی ہے جو ۱۱۲۶ھ/ ۱۷۱۴ء میں لکھی گئی۔جو تاریخی طور پر سلسلۂ نوشاہیہ کا دوسرا اہم تذکرہ ہے۔اس کے مصنف محمد ماہ صداقت کنجاہی (وفات ۱۱۴۸ھ/ ۳۶-۱۷۳۵ء) کا آبائی وطن کنجاہ، ضلع گجرات، پنجاب ہے۔ جب ان کے والد بسلسلہ سرکاری ملازمت کابل میں متعین تھے تو صداقت وہیں پیدا ہوئے۔لیکن ان کی نشوونما پنجاب میں ہوئی جہاں ان کے آباواجداد رہتے تھے۔ان کے چچا محمد اکرم غنیمت کنجاہی صاحبِ مثنوی نیرنگ عشق و مثنوی گلزار محبت، فارسی کے معروف شاعر ہیں۔ یہ خاندان ابا عن جد حضرت حاجی محمد نوشہ گنج بخش قادری (۹۵۹- ۱۰۶۴ھ/ ۱۵۵۲- ۱۶۵۴ء) اوران سے منسوب سلسلۂ نوشاہیہ کا مرید چلا آرہا تھا،صداقت بھی شیخ عبدالرحمان دہلوی کی وساطت سے، جو شیخ پیر محمد سچیار نوشہروی خلیفۂ حضرت نوشہ گنج بخش کے مرید تھے،سلسلۂ قادریہ نوشاہیہ میں داخل ہوئے۔صداقت اپنی ملازمت کے سلسلے میں کچھ عرصہ شاہ جہان آباد (دہلی) میں مقیم رہے۔ چونکہ خود بہت عمدہ ادیب اور شاعر تھے، وہاں اپنے وقت کے نامور فارسی شعرا اور ادبا سراج الدین علی خان آرزو، بندرابن داس خوش گو، آنند رام مخلص وغیرہ سے دوستی ہوگئی اور ان کی مجالس میں آمد و رفت رہی۔ دہلی کے ان تمام ادیبوں نے اپنی اپنی کتب میں صداقت کا ذکر بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔

صداقت نے ثواقب المناقب میں میرزا احمد بیگ لاہوری کے رسالہ دراحوال ومناقب نوشہ گنج بخش کو، جو ۱۱۰۷ھ/ ۹۶-۱۶۹۵ء میں سادہ فارسی نثر میں تالیف ہوا تھا، رنگین اور پرتکلف فارسی میں ڈھالا ہے اوراس میں اپنی فارسی نثر نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اگرچہ کتاب کا ایک بڑا حصہ احمد بیگ کی

☆ ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد (پاکستان)۔

روایات پر مبنی ہیں، لیکن کتاب کا آخری حصہ جہاں شیخ پیر محمد سچیار اور ان کے سلسلۂ مریدین کے حالات ہیں، وہ مصنف (صداقت) کی طرف سے اضافہ شدہ ہے۔ ثواقب المناقب میں اس قدر صنائع بدائع، استعارات و تلمیحات ہیں کہ مصنف کی قدرت تحریر اور احاطۂ علم پر حیرت ہوتی ہے۔ اس کتاب کو متاخر تیموری دور میں ہندوستان کی مصنوع فارسی نثر کا بہتر نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے جس کے کئی ٹکڑے سیال کوٹی مل وارستہ نے اپنی کتاب صفات کائنات اور لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے تذکرۂ گل رعنا میں بھی بطور نمونہ شامل کیے ہیں۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ ۱۹۷۵ء میں راقم السطور نے اپنے ایک ہم وطن نذر حسین چوہدری صاحب کو، جب وہ تہران یونیورسٹی میں مقالہ برائے ڈاکٹریٹ فارسی زبان و ادب لکھنا چاہتے تھے، تجویز کیا کہ وہ ثواقب المناقب پر کام کریں۔ چنانچہ انہوں نے جبھی وہ کام ختم کر لیا جو اب ۲۰۲۰ء میں آ کر شائع ہوا اور مجھے ہی پینتالیس سال بعد اس کے لیے یہ تعارفی سطور لکھنا پڑی ہیں:

ثواقب المناقب، تالیف محمد ماہ صداقت کنجاہی، بہ تصحیح و مقدمہ نذر حسین چوہدری، اسلام آباد، ناشر: مرتب، ۲۰۲۰ء، ۲۸+۶۲۹ صفحات

شیخ زین الدین خوافی کی منہج الرشاد: شیخ ابوبکر بن محمد مدعو بہ زین الخوافی مشہور بہ زین الدین خوافی (۷۵۷-۸۳۸ھ/ ۱۳۵۶-۱۴۳۵ء) سلسلۂ سہروردیہ کے اہم شیخ تھے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ہرات میں گذرا اور وہیں مدفون ہیں۔ خود ان سے سلسلۂ سہروردیہ کی شاخ زینیہ چلی جو ترکی میں زیادہ پھلی پھولی۔ ان کی اہم ترین فارسی تصنیف منہج الرشاد ہے جو انہوں نے رجب یا شعبان ۸۳۱ھ میں لکھی۔ اس کا باعث تصنیف انہوں نے یہ بتایا کہ ان کے دور میں ہرات میں ملاحدہ کی آمد و رفت شروع ہو گئی جنھوں نے لوگوں میں شریعت، قرآن اور مشائخ کے اعتقادات کے خلاف مضامین اور حکایات پھیلانا شروع کیں اور زور دیتے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہی مشائخ کے مذہب اور مسلک کے مطابق ہے۔ شیخ زین الدین خوافی نے ان کی باتوں کا رد لکھا ہے اور قرآن و سنت اور اکابر مشائخ کی کتابوں سے صحیح عقاید پیش کیے ہیں۔ منہج الرشاد اگرچہ اس سے پہلے دو بار شائع ہو چکی ہے ایک بار ایران سے نجیب مایل ہروی نے مرتب اور شائع کی اور دوسری اشاعت پاکستان سے نذر صابری کی ترتیب دادہ ہے۔ اب اس کے ایک قدیم ترین قلمی نسخے کی عکسی اشاعت عمل میں آئی ہے جو مصنف کے حین حیات لکھا گیا۔ اس کی تاریخ کتابت ۱۸ رمحرم

۸۳۸ھ ہے۔اس کے کاتب علی بن صدرالدین جاجرمی ہیں جو مصنف کے مرید تھے۔احتمال ہے کہ یہ نسخہ شیخ کی خانقاہ واقع قریہ زیارت گاہ، ہرات میں لکھا گیا۔اب یہ مخطوطہ خانقاہ مولانا محمد علی چشتی مکھڈی، ضلع اٹک پاکستان سے ملحقہ کتب خانے میں موجود ہے۔راقم السطور نے اس پر ایک مفصل فارسی مقدمہ لکھا ہے جس میں شیخ زین الدین خوافی کے مختصر حالات، ان کے بارے میں دریافت ہونے والے نئے مآخذ اور منہج الرشاد کے دنیا بھر میں معلوم قلمی نسخوں کی تفصیل دی ہے۔یاد رہے کہ منہج الرشاد کے مصنف شیخ زین الدین خوافی، بابر بادشاہ کے دور میں ہندوستان میں ایک مصنف زین الدین خوافی سے مختلف ہیں۔

منہج الرشاد شیخ زین الدین خوافی، چاپ عکسی مجموعۂ خطی کتاب خانۂ مولانا محمد علی مکھڈی، پاکستان، با مقدمۂ عارف نوشاہی، نظامیہ دارالاشاعت، خانقاہ معلیٰ مولانا محمد علی مکھڈی، مکھڈ شریف، ۱۴۴۲ھ/۲۰۲۱ء، ۶۰+۲۶۰ صفحات، تصاویر

پروفیسر محمد اقبال مجددی کی تازہ کاوشیں: راقم السطور کے قلم سے محمد اقبال مجددی صاحب کی تحقیقات اور مطبوعات کا ''معارف'' کے صفحات میں تسلسل کے ساتھ ذکر ہوتا چلا آرہا ہے۔۲۰۲۰ء میں بھی ان کی کئی نئی علمی کاوشیں سامنے آئی ہیں۔کچھ تالیفات ہیں اور کچھ قلمی نسخوں کے عکسیات ہیں جن پر مجددی صاحب نے ناقدانہ اور معلوماتی مقدمے لکھے ہیں۔یہ سب کتب انہوں نے مجھے از راہ دوست نوازی بھیجی ہیں۔یہاں سب کتب پر فرداً فرداً نقد و نظر کا موقع نہیں ہے کہ یہ موجب طوالت ہوگا، صرف ان کے تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے تاکہ اہل علم کم از کم ان کی اشاعت سے باخبر ہو سکیں۔ یہ تمام کتب پروگریسو بکس، اردو بازار، لاہور نے ۲۰۲۰ء میں شائع کی ہیں۔

اوج مورد اسرار نقشبندیہ: تالیف شیخ نظام الدین سرہندی شکارپوری (۱۲۰۴-۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷-۱۷۹۰)، ایک فارسی تذکرۂ مشائخ نقشبندیہ مجددیہ کے قلمی نسخے کی عکسی اشاعت ہے۔۲۲:۱۶۹ص۔

بیاض مفتیان لاہور: گیارہویں صدی ہجری میں لاہور کے محکمۂ شرعیہ اور مفتیوں کے فیصلوں پر مشتمل ایک فارسی قلمی نسخے کی عکسی اشاعت ہے۔۵۳:۹۲ص۔

تذکرۂ علما و مشائخ پاکستان و ہند، جلد چہارم: اس میں کچھ شعرا، سلاطین، امرا، خطاطین اور مورخوں کا تذکرہ بھی ہے۔زیادہ تر مقالات وہی ہیں جو مصنف کی سابقہ طبع شدہ کتب کے مقدمے اور دانش نامہ زبان و ادب فارسی شبہ قارہ کے لیے لکھے گئے ہیں۔۶۷۲ص۔۲۰۱۹ء میں اس سلسلے کی

تیسری جلد بھی شائع ہوئی تھی جس کا بروقت تذکرہ نہ ہوسکا۔

جواہر علّویہ: تالیف شاہ روف احمد رافت مجددی رام پوری (وفات ۱۲۴۹ھ)، مشائخ سلسلۂ نقشبندیہ از آغاز تا شاہ غلام علی دہلوی تذکرہ ہے۔ خانقاہ مظہری دہلی کے فارسی قلمی نسخے کی عکسی اشاعت ہے۔ ۷۴:۲۰۰ ص۔

خواجہ محمد معصوم سرہندی، احوال و آثار و تعلیمات و تحریک احیاء دین: حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند خواجہ محمد معصوم سرہندی (۱۰۰۷۔۱۰۷۹ھ) کا یہ اردو تذکرہ مصنف کی سابقہ مرتبہ کتاب مقامات معصومی کے مقدمہ اور تعلیقات سے ماخوذ ہے۔ ۶۳۲ ص۔

روضۃ السلام: تالیف شرف الدین محمد زبگیر کشمیری (م ۱۲۰۵ھ)، مشائخ نقشبندیہ مجددیہ خصوصاً آخون عبدالسلام نقشبندی کشمیری (م ۱۱۷۱ھ) کے حالات و مقامات پر ضخیم فارسی تذکرہ ہے۔ مجددی صاحب کو اس کا مخطوطۂ انڈیا آفس لندن دستیاب تھا جس کی یہ عکسی اشاعت ہے۔ ۴۱:۹۹۰ ص۔ اس تذکرے کا ایک اور قلمی نسخہ جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر (شمارہ ۲/ ۲۵۱) میں بھی ہے جس کا ذکر اکیڈمی کی فہرست مخطوطات جلد اول ص ۲۵۰ میں ہوا ہے۔ ان دونوں نسخوں کی مدد سے اب اس اہم کشمیری تذکرے کی تنقیدی اشاعت کی ضرورت ہے۔

عمدۃ الصحایف: تالیف منشی محمد عبدالکریم قادری خلیفہ آخوند عبدالعزیز دہلوی، یہ مشائخ قادریہ برکاتیہ کا نایاب اردو تذکرہ ہے، ۳۱۶ ص۔

کشف الغطاء عن اذہان الاغبیا و تبعیۃ المنہاج المتین عن مصائد لصوص الدین: دونوں فارسی رسالے محمد فرخ مجددی (م ۱۱۲۱ھ) کی تالیفات سے ہیں۔ پہلا رسالہ حضرت مجدد الف ثانی کے دفاع میں اور دوسرا ملاحدہ کے رد میں ہے۔ ۲۴:۱۵۴:۶۶ ص۔

ملفوظات شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (م ۱۳۱۳ھ): یعنی مجموعۂ رسائل، مرتبہ نواب زادہ سید نورالحسن خان (م ۱۳۳۶ھ)، عربی، فارسی، اردو رسائل کا مجموعہ ہے۔ ۱۹۱۲ء کے کانپوری ایڈیشن کی عکسی اشاعت ہے۔ ۳۱:۳۰۱:۲۶ ص۔

نسمات القدس و مرآت السالکین: تالیف میرزا مقصود دہبیدی، دونوں کتابیں مشائخ نقشبندیہ مجددیہ دہبیدیہ بالخصوص سید محمد موسیٰ خان خواجہ دہبیدی مدفون سمرقند اور ان کے مریدوں کا فارسی تذکرہ

ہے۔مجددیہ کی یہ شاخ وسطی ایشیا میں پھیلی ہوئی ہے۔دونوں کتابوں کا قلمی نسخہ ذخیرۂ شیخ عارف حکمت، مدینہ منورہ میں موجود ہے جن کی یہ عکسی اشاعت ہے۔۶۸؛۲۶۰؛۵۵ص۔

ایران سے گاہے گاہے پاک و ہند کے قدیم وجدید مصنّفین کی کتب شائع ہوتی رہتی ہیں جن سے ہمارے ہاں کے محققین اور قارئین کی بھی دلچسپی ہے۔ایرانی محققین تواتر کے ساتھ برصغیر کے آثار علمیہ پر کام کررہے ہیں۔کچھ تو جامعاتی سطح پر سَندی مقالات کے طور پر اور کچھ آزاد تحقیق کے طور پر۔چونکہ برصغیر کے مصنّفین کے حالات کے ضمن میں ایرانی محققین کی دسترس میں وہ تمام مآخذ نہیں ہوتے جو ہمیں برصغیر میں دستیاب ہیں،ان کی تحقیق میں حالات کا پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔اسی طرح مقامی ہندی اعلام کی درست قرأت یا تشخیص بھی ایرانیوں کے لیے ایک مسئلہ رہا ہے۔تصحیح متون کے ضمن میں جو کام اساتذہ کا ہے وہ عام طور پر اطمینان بخش ہے لیکن جو کام طالب علموں کا ہے یا بازاری اشاعتوں کے لیے مرتبین کا ہے وہ اغلاط کا مجموعہ ہوتا ہے۔اس کی ایک مثال معارف کے انھی صفحات میں تذکرۂ آفتاب عالم تاب کی ایران اشاعت پر تبصرے کی صورت میں پیش کی جا چکی ہے۔ان کمزوریوں کے باوجود ایران میں برصغیر سے متعلق یا برصغیر کے مصنّفین کی چھپنے والی کتب ہماری دلچسپی کی ہیں اور بوقت ضرورت ہمیں ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔اسی دلچسپی کے پیش نظر یہاں چند تازہ طبع ہونے والی کتب کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے جو مجھ تک پہنچی ہیں۔

۱۔جامع الصنایع والاوزان: فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت (۷۵۲۔۷۹۰ھ) میں ایک ہندوستانی سیف جام ہروی کئی کتب کے مصنف ہیں۔ان کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں لیکن ان کی تصانیف سے تاحال دو کتب دستیاب ہیں۔مجموعۂ لطائف وسفینۂ ظرائف اور جامع الصنایع والاوزان۔ یہ دونوں کتابیں علوم بلاغت اور فنون شعری (صنائع بدائع) سے متعلق ہیں اور اول الذکر میں متعلقہ فنون اور صنائع کے تحت قدیم شعرا کے کلام سے طویل انتخاب دیے گئے ہیں جو بجائے خود اہم ہیں۔مجموعۂ لطائف کی اہمیت کے بارے میں مرحوم ہندوستانی فضلا پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی چند تعارفی مقالات لکھ چکے تھے۔ڈاکٹر نذیر احمد کی صاحب زادی ڈاکٹر ماریہ بلقیس نے مجموعہ لطائف اور چند دیگر مآخذ کی بنیاد پر اپنی ڈاکٹریٹ مکمل کی جو بعد میں ''مجموعۂ ابیات پراکندہ فارسی در ہند'' نام سے ۲۰۰۴ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔انھی کی نگرانی میں فوزیہ وحید نے مجموعۂ لطائف پر سَندی مقالہ

لکھا اور اسے ''ہندو و ایرانی شعرا کا نو دریافت مجموعۂ کلام'' نام سے ۲۰۱۴ء میں علی گڑھ سے شائع کیا۔

۱۹۷۹ء میں افغانستان پر روسی حملے کے بعد وہاں کے کتب خانے برباد ہوئے تو کابل یونیورسٹی میں مجموعۂ لطائف کا ایک نسخہ چوری ہو کر کابل سے لاہور پہنچا۔ راقم السطور نے بھی اسے دیکھا اور اسے فارسی ادب کا ایک نہایت اہم ماخذ پا کر اس پر ایک مفصل تعارفی مقالہ لکھا اور ایران سے شائع کروایا (معارف، تہران، ج ۱۶، ش ۱، فروردین۔ تیر ۱۳۷۸ شمسی/ جولائی ۱۹۹۹ء)۔ اس مقالے کی اشاعت سے ایرانی محققین اس اہم تصنیف کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی ترتیب و تدوین کا سوچنے لگے۔ سب سے پہلے کتاب خانۂ مجلس شورائے اسلامی کے تحقیقی مرکز کے ڈائریکٹر آقاے بہروز ایمانی نے راقم السطور کو پیشکش کی کہ ہم دونوں مل کر اس پر کام کریں اور ان کا ادارہ اسے شائع کرے گا۔ اس کتاب کے نسخۂ لندن کا عکس ان کے پاس اور نسخۂ لاہور کا عکس میرے پاس تھا۔ اس کے لیے دستاویزات بھی تیار ہو گئیں لیکن راقم نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے یہ بھاری پتھر اٹھانے سے معذوری ظاہر کی اور یہ تجویز کاغذی کاروائی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ بعد میں ایک ایرانی طالب علم امید شاہ مرادی نے میری نگرانی میں اس پر ڈاکٹریٹ کے سَندی مقالے کے طور پر کام شروع کیا جو عنقریب فردوسی یونیورسٹی مشہد کو پیش کیا جائے گا۔ یہاں یہ اطلاع دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ میرے مقالے میں نسخے کے کابل سے چرائے جانے کے شواہد موجود تھے۔ جب یہ نسخہ ایک کتاب فروش کے ذریعے فروخت کے لیے کتب خانۂ آستان قدس رضوی پہنچا تو وہاں کے کارپردازوں نے راقم السطور کے مطبوعہ مقالے کے حوالے سے پہچان لیا کہ یہ وہی کابل کا مسروقہ نسخہ ہے۔ اس کی اطلاع افغان حکام کو دی گئی اور نسخہ افغانستان حکومت کے حوالے کیا گیا۔ اب وہاں نیشنل آرکائیوز میں محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ معاصر تاریخ میں ایک مسروقہ قلمی نسخے کا واپس اپنے اصل ٹھکانے پر پہنچنے کا دلچسپ واقعہ ہے۔

مجموعۂ لطائف کے بعد راقم کو سیف جام ہروی کی دوسری تصنیف جامع الصنائع والاوزان کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور سے دستیاب ہوا تو اس پر بھی ایک تعارفی مقالہ لکھا اور ایران میں چھپوایا (معارف، تہران، جلد ۱۹، شمارہ ۱، فروردین۔ تیر ۱۳۸۱ شمسی/ ۲۰۰۲ء)۔ اس مقالے نے بھی ایرانیوں کی توجہ حاصل کی اور ایک ایرانی خانم زینت صادقی نژاد نے اس کی تدوین و ترتیب کو پہلے ایم اے کا سندی مقالہ بنایا اور اب اس پر نظر ثانی کر کے شائع کیا ہے۔

جامع الصنایع والاوزان، تالیف سیف جام ہروی، تصحیح و تحقیق زینب صادقی نژاد، ناشر موقوفات دکتر افشار و انتشارات سخن، ۲۰۲۰ء، ۳۳۷ صفحات

یہ کتاب چار قسم پر مشتمل ہے: ۱۔اصول و فروع در قواعد نظم، ۲۔محاسن اشعار، ۳۔معایب اشعار، ۴۔طرزہای نظم و شرح کلمات مشکل از پارسی و پہلوی۔ مصنف نے چوتھی قسم میں شاعری کے جو اسالیب متعارف کروائے ہیں وہ دلچسپ ہیں: حکیمانہ، یہ سنائی غزنوی کی طرز ہے؛ فاضلانہ، یہ انوری کی طرز ہے؛ مترسلانہ، یہ ظہیر کی طرز ہے؛ مدققانہ، یہ کمال کی طرز ہے؛ محققانہ، یہ عبدالواسع جبلی کی طرز ہے؛ ندیمانہ، یہ فردوسی کی طرز ہے؛ عاشقانہ، یہ سعدی کی طرز ہے؛ خسروانہ، یہ امیر خسرو کی طرز ہے جو لطافت نظم کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اور کمالات سخن پر مبنی ہے۔ سیف جام ہروی نے اسالیب کی اس تقسیم بندی میں امیر خسرو کے دیباچۂ دیوان غرۃ الکمال سے استفادہ کیا ہے۔ مصنف نے امیر خسرو کی ایجاد کردہ صنایع لفظی کا خاص طور پر مثالوں سے ذکر کیا ہے۔ پوری کتاب میں امیر خسرو کا نام ادب سے ''خسرو شاعران'' لکھا ہے۔ دہلی کو ''حضرت دہلی، مرکز شادمانی، بلکہ فردوس ثانی'' قرار دیا ہے۔

سیف جام ہروی کا کہنا ہے معنوی بدایع جس دل آویزی کے ساتھ ہندی زبان میں ادا ہو سکتی ہیں فارسی میں نہیں۔ مصنف نے ہندی جملوں اور فقروں سے چند مثالیں بھی دی ہیں، جو کتاب کی مرتب خاتون کی ہندی سے عدم واقفیت کی بنا پر درست نقل نہیں ہو پائے۔ اسی طرح ایک صنعت ''ذوالمعنیین غامض'' کے تحت مصنف نے ایسے الفاظ کے حامل اشعار نقل کیے ہیں جن سے ایک معنی عربی اور ایک ہندی، یا ایک فارسی اور ایک ہندی متبادر ہوتا ہے۔ جیسے:

ہندو بچہ ای دوش زبس زیبائی افگندہ دلم را بہ غم و شیدائی
چون دوش بگفتم کہ بیایم، ترسید فریاد برآورد کہ: ''مائی، مائی''

۲۔مثمر: سراج الدین علی خان آرزو (۱۱۶۹-۱۰۹۹ھ/۱۷۵۶-۱۶۸۷ء) برصغیر میں فارسی شعر، ادبی تنقید، لغت نویسی اور تذکرہ نگاری کے حوالے سے ایک سربرآوردہ شخصیت ہیں۔ انہیں یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں سنسکرت اور فارسی کے حوالے سے پہلی بار توافق لسانین کا نظریہ پیش کیا اور علم اصول لغت پر ایک مستقل کتاب ''مثمر'' تصنیف کی۔ یہ غالباً ان کے آخری سالوں کی تصنیف ہے، گویا ان کی زندگی بھر کے مطالعے کا نچوڑ ہے۔ مثمر کی تصنیف کے وقت ان کے

پیش نظر جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء) کی عربی تصنیف ''المزھر'' تھی جو عربی علم لغت پر ہے اور آرزو نے اپنی کتاب فارسی علم اصول لغت پر لکھی ہے۔ یہ اپنے موضوع پر ایک جامع اور ضخیم کتاب ہے اور مصنف نے اسے بیالیس ''اصل'' پر تقسیم کیا ہے۔

مثمر پہلی بار ڈاکٹر نذیر احمد کی صاحب زادی ڈاکٹر ریحانہ خاتون نے مرتب کی تھی اور اسے کراچی یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ فار سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین سٹڈیز نے ۱۹۹۲ء میں شایع کیا۔ اس ایڈیشن کا ایک حصہ ڈاکٹر ریحانہ کے اپنے سواد تحریر میں تھا اور ایک حصہ قلمی نسخے کے عکس پر مبنی تھا۔ جسے پڑھنا ہر کس و ناکس کے لیے ممکن نہ تھا۔ ڈاکٹر ریحانہ نے وہ حصہ جو قلمی نسخے پر مبنی تھا یعنی کتاب کی آخری تین ''اصل''، اسے از سر نو مرتب کر کے ٹائپ کروا کر ۲۰۱۷ء میں دہلی سے خود ہی شائع کیا۔

اب ایک ایرانی محقق سید محمد راستگو نے مثمر کا مکمل تنقیدی متن ایران سے شائع کر دیا ہے:

مثمر (نخستین کتاب فارسی دربارۂ زبان شناسی و علم اللغہ)، نوشتۂ سراج الدین علی خان آرزو، مقدمہ و تصحیح سید محمد راستگو، میراث مکتوب، تہران، ۲۰۲۰ء، ۵۹۷+۱۱۳ صفحات

مرتب نے مثمر کے پانچ قلمی نسخے استعمال کیے ہیں اور ڈاکٹر ریحانہ کے ایڈیشن (کراچی، دہلی) کو بھی دیکھا ہے جسے وہ ''سرشار از غلط خوانی و غلط نویسی'' قرار دیتے ہیں (مقدمہ، ص ۳۲)۔ سید محمد راستگو نے مثمر پر اپنا کام پہلی جلد کے طور پر پیش کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ دوسری جلد تعلیقات و حواشی پر عنقریب شائع ہوگی۔ مرتب نے اس جلد میں تقریباً سو صفحات کا مقدمہ لکھا ہے جس میں مثمر کی اہمیت اور خان آرزو کے احوال و آثار ان کی اپنی زبانی بیان کیے ہیں۔ آرزو کے حالات میں ایرانی مرتب نے اپنے مقدمے میں خواہ مخواہ آرزو کے سنی یا شیعہ ہونے کی بحث ڈالی ہے۔ ایرانی مرتبین کا یہ شیوہ ہے کہ اہل سنت و جماعت مذہب کے مصنّفین کی تصانیف میں حضرت علی یا اہل بیت یا بارہ اماموں کی مدح میں عبارتیں اور اشعار دیکھ کر جھٹ انہیں ''شیعہ'' یا ''شیعہ مائل'' قرار دیتے ہیں اور اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ تمام اہل سنت کے ہاں اہل بیت اور ائمہ اثنی عشر کی محبت اور احترام جزو ایمان ہے۔ آرزو کا معاملہ بھی ایسا ہے۔ وہ سنی المذہب تھے۔ اگر ان کی تصانیف میں حضرت علی یا دیگر ائمہ کی مدح سرائی ہوئی ہے تو وہ سنی عقیدے کے مطابق ہے۔

آرزو کی تصنیفات میں سے سراج اللغۃ بھی ایسی کتاب ہے جس پر ڈاکٹر ریحانہ نے کام کیا تھا

لیکن ان کی مرتبہ سراج اللغۃ تاحال منظر عام پر نہیں آئی۔سید محمد راستگو نے اپنے مقدمے میں یہ اطلاع دی ہے کہ وہ بھی سراج اللغہ پر بھی کام کررہے ہیں۔ڈاکٹر ریحانہ کو چاہیے کہ وہ اپنا کام جلد شائع کریں۔

۳۔مقالات عارف: راقم السطور کے فارسی مقالات کی تیسری جلد حال ہی میں ایران سے شائع ہوئی ہے۔اس سلسلے کی پہلی اور دوسری جلدیں بالترتیب ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی تھیں۔تینوں جلدیں ایک ہی ناشر کی طرف سے اشاعت پذیر ہوئی ہیں:

مقالات عارف (درزمینۂ ادبیات فارسی ونسخہ شناسی)،جلدسوم، موقوفات دکتر افشار و انتشارات سخن،تہران،۲۰۲۰ء، ۷۱۲ صفحات

اس جلد میں چار قدیم رسائل (عربی وفارسی) کے مکمل متن اور ۲۳ مفرد مقالات شامل ہیں۔ قدیم رسائل میں ابوسعید عبدالباقی بن علی بن عبدالحق ملقب بہ فرید کازرونی کا رسالہ افواج الامواج من بحار الاشواق پہلی بار شائع ہوا ہے۔یہ ۸۳۷ھ کی تصنیف ہے اور اس میں خراسان میں شیخ علاء الدولہ سمنانی کے سلوک پر بحث ہے اور شیخ کے ایک مرید کی خانقاہ میں مصنف کی آپ بیتی بیان ہوئی ہے۔شیخ علی متقی برہان پوری کے دو رسائل التجریب الوافی فی الحبر الصافی (فارسی) اور نعم المعیار والمقیاس فی معرفۃ مراتب الناس (عربی) بھی شامل ہیں،مفرد مقالات میں کچھ مقالات برصغیر کے مصنّفین کی تصانیف کے بارے میں ہیں جیسے مکتوبات شاہ طاہر دکنی، الفتوحات المکیہ و الفیوضات المدنیۃ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اسرار الخط شیخ فضل اللہ بن شیخ عطاء اللہ اورنگ آبادی، حدیقۂ ہندی بھگوان داس ہندی، سراج اللغہ سراج الدین علی آرزو۔سوانحی مقالات میں قدرت اللہ بلیغ اور آفتاب رائے لکھنوی پر مقالات ہیں، کتاب کے ایک باب میں برصغیر میں ایرانی اور تورانی شعرا اور مصنّفین کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔چنانچہ سنائی غزنوی، میر سید علی ہمدانی، کمال خجندی، عبدالرحمٰن جامی اور محتشم کاشانی پر مقالات شامل ہیں۔اسی باب میں خجند اور ہرات کے مصنّفین کے آثار جو برصغیر میں پائے جاتے ہیں ان پر دو الگ مقالات ہیں۔مخطوطات شناسی کے باب میں ہرات کے ایک کاتب محمد قاسم بن درویش محمد عصار کے کتابت کردہ مخطوطات اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی اور مکتبہ عارف حکمت کے بعض ایسے مخطوطات کا تعارف ہے جو برصغیر سے متعلق ہیں۔قدیم زمانے میں مخطوطات کی کیا قیمت ہوا کرتی تھی؟اس دلچسپ موضوع پر پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ۴۶ نسخوں کو بنیاد بنا کر مقالہ لکھا گیا ہے۔

معارف کی ڈاک

مکتوب بنگلا دیش

ڈھاکہ، بنگلا دیش
واٹسپ نمبر: +8801305817240
ashrafalam174@gmail.com
۲۷/ذی الحجہ ۱۴۴۲ھ

مکرمی مدیر دارالمصنّفین اعظم گڑھ یوپی الہند!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدازاں انتہائی ادب واحترام کے ساتھ عرض یہ ہے کہ بندہ اشرف عالم قاسمی ندوی کی دوران تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالمصنّفین کے احاطہ میں حاضری ہوئی، ادارہ اورارباب ادارہ سے مستفید ہونے کے بعد ان سے روابط کے ذریعہ علمی سفر کو جاری رکھنے اور فکر شبلیؒ وسلیمانؒ سے منسلک رکھ کر منزل تک پہنچنے کی کوشش اب زندگی کا مقصد ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام کے دوران اپنے ملک اور بنگالی قوم کو دارالمصنّفین کے علمی و تاریخی خزائن سے بہرہ ور کرنے کے لیے مقامی علماوفضلا سے موضوع کی اہمیت کا ذکر کر کے درخواست کرتا رہا کہ ان علوم وفنون کو بنگالی زبان میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ سیرت عائشہؓ، خطبات مدراس اور بہادر خواتین اسلام ''رہنما پروکاشنی'' بنگالہ بازار، ڈھاکہ، بنگلادیش نے اہتمام سے بنگالی زبان میں شائع کیں۔

ملک واپسی کے بعد ''رہنما پروکاشنی'' سے خاص روابط رکھے، اب الحمدللہ دارالمصنّفین کی تاریخی شہرۂ آفاق تصنیف ''سیر الصحابہ'' مکمل کی افادیت ونافعیت کو بنگالی مسلمانوں اور علمی حلقہ تک پہنچانے کے علاوہ تابعین اور تبع تابعین کے ترجمہ کا فریضہ بنگالی زبان میں دسترس رکھنے والے علما نے انجام دیا ہے، جہاں آٹھوں جلدوں کا ترجمہ ہو کے پروف ریڈنگ کا کام جاری ہے، بندہ راقم نے بھی اس عظیم خدمت میں شریک کار ہو کر جلد نمبر نو کے ترجمہ کی سعادت حاصل کی ہے۔

بنگلادیش کے طباعتی میدان میں اہل علم کی زیرنگرانی کام کرنے والا معروف ومشہور ادارہ ''رہنما پروکاشنی'' اس خدمت کو منظر عام پر لانے کے لیے گامزن ہے، اس کے لیے دارالمصنّفین سے

تحریری اجازت کے ساتھ اراکین ادارہ سے دعا کا خواہاں ہے۔

اس سلسلہ میں دارالمصنّفین واراکین ادارہ سے جو بھی مفید مشورہ ہوگا وہ ''رہنما پروکاشنی'' کے سربراہ ونگراں اعلیٰ جناب مولانا محمود الاسلام کی طرف سے بسر وچشم تسلیم کرنے کا وعدہ ہے۔

العارض	کتبہ
رہنما پروکاشنی	طالب دعا
مولانا محمد محمود الاسلام	مولوی اشرف عالم قاسمی ندوی
سربراہ ونگران اعلیٰ	ڈھاکہ، بنگلادیش
رہنما پروکاشنی، بنگالہ بازار، ڈھاکہ، بنگلادیش	

مکتوب بیگوسرائے

بیگوسرائے، بہار

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ذی علم حضرات سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ علوم اسلامیہ میں بعض امور کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے جو غیر مستند وغیر معتبر ہوتی ہے، ایسے امور کی فہرست طویل ہے۔ مثلاً سید الشہداء حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بعد مثلہ والی روایت ہے۔

تحقیقی انفرادیت کے حامل بلکہ تحقیق کی آبرو ڈاکٹر راہی فدائی کی کتاب ''شواہد'' سے قبل کئی کتابوں میں عام طور سے سید الشہداء کی شہادت کے بعد مثلہ کا واقعہ ہندہ بنت عتبہ کے حوالے سے نظر سے گزرا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی قابل قدر اور لائق تحسین تحقیق کے بعد ایمانی تقاضے اور دینی جذبے کی بنیاد پر اب ضروری ہے کہ اس من گھڑت واقعہ کا ذکر بند کیا جائے، خصوصاً مروجہ درسی مواد میں ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے حوالے سے قدغن لگانا ضروری ہے، حقیقت حال سامنے آجائے تو ہمیں اس تحقیقی کاوش کی وسعت قلبی کے ساتھ پذیرائی کرنے اور کشادہ ذہنی سے اس پر غور وفکر میں کسی طرح تکلف وتردد کو راہ نہیں دینا چاہیے۔ گو ہمارے افتاد مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ مشکل کام ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ؎

آئین نو سے ڈرنا ، طرز کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اس واقعہ کی صداقت اور روایت کے پس پشت سیاسی اور مذہبی عوامل اور پھر ہندہ بنت عتبہ

اوران کے اہل خاندان کے تعلق سے عام مسلمانوں کے خاص جذبات کے پیش نظر دل چاہتا ہے کہ اہل علم و دانش خاص اسی موضوع پر کسی سمینار اور سمپوزیم کا انعقاد کرتے، موجودہ حالات کے پیش نظر ویبی نار وغیرہ کے ذریعہ بھی اس روایت اور حکایت کی حقیقت سامنے آجائے تو اس کے اچھے اثرات کی توقع بڑھ جائے گی۔

خوشی کی بات ہے کہ تاریخ اسلام کا یہ باب وطن کے اس خطے سے منقح و مصحح ہو کر وا ہوا ہے جس نے ماضی میں ''خطبات مدراس'' (علامہ سید سلیمان ندویؒ)، ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' (علامہ اقبالؒ) اور ''خطبات ماجدی یا سیرۃ نبوی قرآنی'' (مولانا عبدالماجد دریابادی) کی شکل میں اردو کے تاریخی وفکری ادب کو بے مثال تحفے عطا کیے ہیں۔ جنوبی ہند کی اس دیرینہ روایت کے مدنظر ایک بار پھر اسی کی طرف امید بھری نگاہیں اٹھتی ہیں، کیونکہ:

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے

والسلام (جناب) راجو خاں

مکتوب لکھنؤ

C-96
ابرار نگر، لکھنؤ، ۲۲۶۰۲۲
موبائل: 9451970477
۱۶؍جولائی ۲۰۲۱ء

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف جون میں مضمون میر کے سوانح اور نثار احمد فاروقی سے یہ پتا نہیں چلتا کہ فاضل مضمون نگار کے سامنے میر کی آپ بیتی کا جو نسخہ ہے اس کا سال اشاعت کیا ہے، کیونکہ انہوں نے مضمون کے آخر میں جو حوالے درج کیے ہیں، اس میں کتاب کا سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''نثار احمد فاروقی نے دوسرے ایڈیشن کو ۳۵ سال میں تیار کیا'' (ص ۴۵۵)، جبکہ مضمون کے ص ۴۶۰ پر یعنی محض پانچ صفحے کے بعد کہا گیا ہے کہ ''میر کی آپ بیتی کی دوسری اشاعت انجمن ترقی اردو سے ۱۹۹۶ء میں ہوئی''۔ واضح رہے کہ میر کی آپ بیتی کا پہلا ایڈیشن مکتبہ برہان دہلی سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ (ص ۴۵۴)، اس لحاظ سے اگر شمار کریں تو یہ مدت ۳۹ برس قرار پاتی ہے۔ کتاب میں خلیق انجم کے مقدمہ سے

یہ بات سامنے آتی ہے کہ اتر پردیش سرکار نے اپنے ایک اعلامیہ کی رو سے اس کتاب کو ۱۹۵۹ء میں ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔ پتا نہیں کس طرح فاضل مضمون نگار نے اتر پردیش سرکار کا مطلب اتر پردیش اردو اکیڈمی سمجھ لیا، واضح رہے کہ اتر پردیش اردو اکادمی کا قیام ۱۹۷۰ء کے بعد عمل میں آیا ہے۔ اسی صفحہ پر یہ لکھا ہے کہ ''میر پہلے شاعر ہیں جنھوں نے خودنوشت لکھی''۔ یہ بات بالکل درست ہے مگر اس کے آگے جوش بیان میں یہ بھی لکھ دیا گیا کہ ان کی سوانح ان کی زندگی کی مکمل تصویر کشی کرتی ہے۔ یہ بات سراسر غلط ہے۔ اتنی بات تو سبھی جانتے ہیں کہ میر نے اپنی آپ بیتی دلی میں لکھی، اس لیے لازمی طور پر اس میں صرف دلی کا احوال بیان ہوا ہے اور لکھنؤ میں میر کے قیام کی مدت اٹھائیس برس ہے۔ دلی میں ان کے صرف دو دیوان ہی مکمل ہوئے تھے، باقی چار دیوان لکھنؤ میں تصنیف ہوئے جن کا کوئی احوال نہیں ہے آپ بیتی میں۔ نیز میر نے اس کتاب میں اپنی پیدائش کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ اس لیے اس خودنوشت کو میر کی زندگی کی مکمل تصویر کہنا نامناسب ہے۔ یہ خیال بھی رہے کہ اس آپ بیتی میں میر صاحب ایک مسافر اور سیاح کی طرح نظر آتے ہیں، جس کی تفصیل مضمون میں دیکھی جا سکتی ہے، جبکہ میر کی شعرو شاعری کے احوال سے یہ کتاب خالی ہے، میر اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں، ان کے گھر پر ماہانہ نشست ہوتی تھی، معاصرین سے ان کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ ان باتوں کا میر نے خودنوشت میں کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ خان آرزو میر کے ماموں تھے اور دلی انہیں کے بھروسے پر آئے تھے اور میر کے تعارف کا وہ ایک اہم ذریعہ بھی تھے۔ میر نے خان آرزو سے بہت استفادہ بھی کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نثار احمد فاروقی نے بنیادی طور پر مترجم کا فریضہ انجام دیا، واقعات کی صحت پر انھوں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔ مگر بعد میں کچھ نئے حقائق سامنے آئے ہیں۔ میر کی آپ بیتی کے مقدمے کا ایک اقتباس دیکھیں۔

> ''ان کے سوا بھی میر نے بعض سفر کیے جن کا تذکرہ ذکر میر میں نہیں ہے۔
> نسنگ، کے سفر کا حال کلیات میر میں شامل مثنوی نسنگ نامہ سے معلوم ہوتا ہے''۔
> (میر کی آپ بیتی، ص ۴۸، ۱۹۹۶ء، انجمن ترقی اردو ہند)

اس اقتباس پر نثار احمد فاروقی نے حاشیہ لگایا ہے 'کلیات میر (مرتبہ عبدالباری آسی) لکھنؤ ۱۹۴۰'۔ معارف کے مضمون نگار نے یہ اقتباس نثار احمد فاروقی کے کھاتے میں ڈال دیا ہے، دراصل

معاملہ یہاں مثنوی کے درست نام کا تھا اور یقیناً نثار احمد فاروقی کو کچھ شبہہ رہا ہوگا، اسی لیے انہوں نے کلیات میر مرتبہ آسی کا حوالہ دے کر اپنے کو بچا لیا، شمس الرحمان فاروقی کی نگرانی میں کلیات میر جلد دوم کی تحقیق و ترتیب کا فریضہ پروفیسر احمد محفوظ نے انجام دیا، پروفیسر احمد محفوظ جلد دوم کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"میر کی ایک مثنوی "تسنگ نامہ" کے نام سے مشہور ہے اور کلام میر کے تمام مشہور اور متداول مطبوعہ نسخوں میں یہ اسی نام سے شامل ہے۔ زیر نظر کلیات کی تدوین کے دوران ہی چودھری محمد نعیم کی انتہائی اہم کتاب مطبوعہ آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس منظر عام پر آئی جو میر کی خودنوشت "ذکر میر" کا انگریزی ترجمہ ہے۔ چودھری نعیم صاحب کی اس کتاب سے معلوم ہوا کہ جس گاؤں کے سفر کا ذکر میر نے اپنی مثنوی میں کیا ہے، اس کا نام "نسنگ" (یعنی مع ن) نہیں بلکہ "تسنگ" (یعنی مع ت) Tisang ہے۔ چودھری نعیم نے لکھا ہے کہ سرکاری کاغذات کی جانچ سے اس نام یعنی "تسنگ" کی تصدیق ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں "تسنگ" کو صحیح ماننے بغیر چارہ نہ تھا۔ پھر بھی مزید تصدیق کے خیال سے میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے اردو خط و کتابت کورس کے شعبہ سے وابستہ جناب جمیل احمد سے بھی اس بات کا ذکر کیا۔ موصوف کا تعلق ضلع میرٹھ سے ہے اور وہ اس علاقے کی بہت سی جگہوں کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ میرٹھ میں ایک مشہور قصبہ لاوڑ نام کا ہے اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک بستی ہے جسے بول چال میں تسن Tisan (بکسر اول و فتح دوم، بلا کاف فارسی) کہتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ وہی "تسنگ" ہے جو کثرت استعمال سے زبانوں پر "تسن" کی صورت میں رائج ہوگیا ہے۔ اب میر کی مثنوی کا یہ شعر بھی واضح ہوگیا ؎

واں سے لاوڑ تسنگ پھر واں سے جا کے واں تنگ آ گئے جاں سے

ان شواہد کی بنا پر مذکورہ مثنوی کو "تسنگ نامہ" کے عنوان سے ہی کلیات میں شامل کیا گیا ہے۔ اور جہاں جہاں لفظ "نسنگ" آیا ہے وہاں اسے "تسنگ" کر دیا گیا ہے۔ برسبیل تذکرہ کلب علی خاں فائق نے اپنے مرتب کردہ کلیات میر میں اس مثنوی کا عنوان "تسنگ نامہ" (مع ت) ہی لکھا ہے۔ (کلیات میر، ج ۲، مرتبہ احمد محفوظ، ص ۲۰، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

راقم الحروف کا خیال تھا کہ شاید جلدی میں ان مسامحات کو جگہ مل گئی، اسی لیے یہ وضاحت کی جارہی ہے۔

حکیم وسیم احمد اعظمی

ادبیات

غزل

جناب زاہد جعفری☆

کسی بشر کے نہ بس میں، نہ اختیار میں روح!
تڑپ رہی ہے عناصر کے گھیرے غار میں روح!

بڑے غضب کی یہ شرمیلی شاہزادی ہے
اکیلی رہتی ہے مٹی کے اس دیار میں روح!

کہاں ہے محملِ لیلائے زندگی روپوش؟
تلاش کرتی ہے دیوانے کی غبار میں روح!

نہ جانے رات کے کس پہر میں وہ آجائے
بچھا کے آنکھوں نے رکھ دی ہے رہ گزار میں روح!

خدا نخواستہ دیوانے دونوں ہوجائیں
ترے خیال میں دل، تیرے انتظار میں روح!

قفس میں آج وہ پنچھی کو بے قراری ہے
نکل نہ جائے کہیں موسمِ بہار میں روح!

لباسِ سرخ میں دیکھا جو بنتِ موسم کو
کسی کی جلنے لگی آتشِ چنار میں روح!

کمر لچکنے لگی خود جوان وادی کی
جو نغمہ زن ہوئی پانی کی آبشار میں روح!

وہ جانتا بھی ہے زاہد! کہ دل کے کاغذ پر
غزل کے پھول کھلاتی ہے کس کے پیار میں روح!

ہم نہیں سمجھے

جناب وارث ریاضی☆☆

جفا سے اب اسے انکار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
یہ حسنِ التفات یار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

یہاں تو تیرے دیوانوں کی ہر دم بھیڑ رہتی تھی
یہ سناٹا سرِ دربار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

جو سیرت اور صورت میں نہیں اچھا تو پھر اس کا
زمانہ طالبِ دیدار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

زمانہ جس کے آگے احتراماً سر جھکاتا تھا
وہ دنیا میں ذلیل و خوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

وہ سفاکِ زمانہ، ظالم و جابر، جفا پرور
وفاؤں کا علم بردار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

تری دنیا میں جو سب سے بڑا خوں خوار ہے یارب!
زمانے کا وہی سردار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

تو انساں ہے، تجھے انسانیت کا درس دینا ہے
ترے ہاتھوں میں یہ تلوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

ہمیں برباد کرنے میں کسر کوئی نہیں چھوڑی
تو پھر برہم مزاج یار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

فروغِ حکمت و دانش کے پندارِ مسرت میں
پریشاں عظمتِ کردار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

دلِ انساں پہ جس نے کی حکومت مدتوں وارثؔ
وہ رسوائے سرِ بازار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

☆ جعفری باغ، جلال پور، فیض آباد۔ موبائل: ۹۴۵۲۶۵۲۴۸۸
☆☆ کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، والیالوریا، مغربی چمپارن، بہار۔ موبائل: ۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

مطبوعات جدیدہ

دیوان غالب: مرتبہ پروفیسر عبدالحق، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۶۶، قیمت ۵۰۰ روپے، ناشر: نیشنل مشن فار مینیسکرپٹس، ۱۱۔مان سنگھ روڈ، نئی دہلی۔

غالب شناسی کا حق اور دعویٰ، ادبی جمہوریت کی موجودگی کا اعلان ہے، لیکن غالب کی معرفت کی راہ اگر اقبال کے شعری وشعوری مکان ومقام سے ہو تو پھر صاحب ذوق کے لیے شوق کی ہر منزل یہ کہتے ہوئے طے ہوجاتی ہے کہ ہاں غالب تو سراپا روح ہے جس کا پیکر ہی بزم سخن ہے، جس کے فردوس تخیل سے قدرت کی بہار ہے اور کشت فکر سے عالم سبزہ دار ہے، غالب سے بڑھ کر کون فخر روزگار ہے اور کس میں پنہاں ایسا موتی آبدار ہے، زیر نظر دیوان غالب کے مرتب کی شخصیت، اقبال کے جلوؤں میں ظاہر بھی ہے اور مستور بھی، ان کو دیوان غالب کا ایک خطی نسخہ ملا، جو غالب کی وفات کے معاً بعد کا ہے، کاتب منوہر لعل ہیں جنھوں نے ہندوؤں کے ایک رئیس صاحب رام جی کی فرمائش پر نقل کیا، فاضل مرتب نے اسے کوئی تاریخی دریافت نہیں کہا بلکہ ان کے نزدیک یہ معلوم شدہ قلمی نسخوں میں بس ایک اضافہ ہے، ہاں غالب کے انتقال کے صرف تین مہینوں بعد یہ مخطوطہ مکمل ہوا اور شاید یہ پہلا نسخہ ہے جو کسی غیر مسلم رئیس کو پیش کیا گیا، فاضل مرتب کے نزدیک اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کا انداز تحریر، زمانہ غالب کا عکاس ہے۔ یہ قلمی نسخہ قریب پچاس سال سے ڈاکٹر صاحب کے خزانۂ کتب میں محفوظ تھا، اب اس کی قسمت نے یاوری کی اور ڈاکٹر صاحب نے تحقیق و تدوین کے مروجہ پیمانوں کے مطابق ایک بہترین مقدمہ کے ساتھ اصل مخطوطہ کو غالب کی دنیا کا ایک اور خوبصورت حصہ بنادیا، یہ ان کا حق بھی تھا اور اس لیے تھا کہ جہان اقبال کی زندگی بھر سیر کے باوجود ان کو یہ اعتراف بھی رہا کہ غالب فنی عظمتوں کے حیرت افروز شاعر ہیں، اس لیے غالب کے مطالبے کچھ اور بھی ہیں یعنی نائے ونوش اور نغمہ ونشاط کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، اسی بہت کچھ کی تلاش کو اگرچہ فاضل مرتب نشاط کار کی ہوس سے تعبیر کرتے ہیں، مگر حقیقت یہی ہے کہ غالب شناسوں کی بلند قامتی، خود ان کے قامت کی درازی پر اثر انداز نہیں ہوسکتی اور یہ ان کے مقدمہ سے ظاہر اور ثابت ہے، جہاں انھوں نے بڑے اعتماد سے کہہ دیا کہ غالب شناسوں اور اس میں سارے مقتدر و محترم شامل ہیں، ان سے فروعی اور اصولی دونوں غلطیاں ہوئی ہیں، غالب کو بھاری پتھر سمجھا گیا، بوسہ دیا گیا، طواف بھی کیا گیا مگر یہ سارے مناسک اب بھی زماں و مکاں کے حجاب سے کسی مرد غیب کے ظہور کے منتظر ہیں، جب صاحب ترتیب اس فکر کا حامل ہو کہ متن کی درستگی کے بغیر افکار و اسالیب کا تعین مشکل ہی نہیں، مہمل بھی ہے، تو بہتر اور خوب تر کے امکانات پر یقین ہونا ہی چاہیے، یہ جملہ بھی کیا خوب ہے کہ کسی فرد

سے تکمیلیت کی توقع ایک تمنائے خام ہے۔اقبال کے مرید روحانی کو اگر یہ کشف ہو کہ عظمت غالب ایک مدت سے پیوندز میں ہے اس کو نئے آسمانوں کی تلاش ہے تو یہ مبنی برحق ہی ہے،زیر نظر نسخہ دیوان غالب،غالباً اسی تلاش کا حصہ ہے،جس میں صرف دوسرے مخطوطات و مطبوعات سے موازنہ،اشعار و کتابت میں کمی بیشی کا منشیانہ عمل ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔

الطریق الی الاردیة (اول، دوم): ازمولانا ابوطاہر المصباح،متوسط تقطیع،عمدہ کاغذ و طباعت،صفحات بالترتیب ۲۳۴،۲۳۴، قیمت ۱۵۰، ۱۸۰ ٹاکا، پتہ: شعبۂ نشر و اشاعت، مدرسہ المدینہ، حضرت پور، کرانی گنج، ڈھاکہ، بنگلادیش۔

بنگالیوں کو بنگلہ زبان کے ذریعہ اردو سکھانے کی کوششیں پہلے بھی ہوئی ہوں گی لیکن اب بنگلہ دیش میں اردو کی تعلیم و تدریس محض ایک فنی عمل نہیں، یہ متاع گم گشتہ کی تلاش اور بازیافت کی مہماتی کوشش بھی ہے،قواعد اردو کی اس کتاب کے مصنف کی فکر کی ندرت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ زبان کے اس فرق سے واقف ہیں کہ زبان ایک تو مادری ہوتی ہے دوسری مادرزاد،اس کی تشریح بھی انہوں نے خوب کی ہے مگر جب بنگلہ دیش میں اردو کی حیثیت کو سمجھنے کی بات ہوئی تو انہوں نے بنگلہ زبان کے ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے اس کا سیکھنا فریضہ قرار دیا،نصاب تعلیم کی بنیاد اگر قرآن اور سنت ہے تو عربی زبان کی اہمیت کا انکار ممکن نہیں،ایسے میں یہ کہنا کہ بلاشبہہ اس زمانے میں اردو علوم القرآن والسنہ کی زبان بن چکی ہے اس لیے اردو کا سیکھنا بھی فریضہ ہے اور اس کی تعلیم لازمی ہے گو ایک معین حد تک ہی، یہ قطعی قول حق ہے۔مصنف کا پورا مقدمہ جو حصہ دوم میں ہے وہ صرف بنگلہ دیش کے ماہرین تعلیم ہی کے لیے نہیں برصغیر کے ہر علاقہ کے لیے بار بار پڑھنے اور سوچنے کے لائق ہے۔اصل خوبی اور تعریف کے لائق بات یہ ہے کہ زیر نظر دونوں کتابوں کے ذریعہ انہوں نے اردو سکھانے کے جو عملی سبق دیے ہیں وہ کمال کے ہیں اور روایتی قواعد زبان سے قطعی جدا ہیں، پہلے حصہ میں بنگالی زبان کا زیادہ غلبہ تھا، اس لیے ہمارے لیے اس کی خوبیوں سے واقف ہونے میں دشواری تھی، مگر دوسرے حصہ سے پتہ چلا کہ مصنف نے زندگی کے تدریسی تجربوں سے جو سیکھا، اس کو کتنی مہارت سے اس کتاب میں پیش کر دیا،خود انہوں نے مثال دی کہ ایک حرف کی پہچان کے بعد اس حرف پر مشتمل آسان اور معروف الفاظ دیے گئے پھر ان کو خوبصورت جملوں میں استعمال کیا گیا ایسے جملے جن میں بچوں کے معیار سے ادبیت کے ساتھ دینی، اخلاقی اور فکری رہنمائی کا فرض بھی ادا ہوتا جاتا ہے۔پہلی جلد میں سات اور دوسری میں گیارہ ابواب ہیں،ان کے تحت اسم،فعل،ضمیر،تذکیر تانیث،اضافت،حروف ربط،صفت،مبالغہ،مصدر لازمی و متعدی و مرکب غرض صرف و نحو کا شاید ہی کوئی پہلو رہ گیا ہو،اور یہ تو عموماً قواعد کی ہر کتاب کا لازمہ ہے۔یہاں

خاص یہ ہے کہ ان مباحث کو سمجھانے کا جو طریق ہے وہ ہے داد کے لائق، کہیں کہیں تو مصنف کو بھی اندازہ ہوا کہ خالق لوح وقلم نے ان سے کچھ اور ہی کام لے لیا، جیسے دوسرے حصہ کا پانچواں باب جس میں ابجدی ترتیب سے الفاظ اور جملے اس طرح یکجا کیے گئے کہ واقعتاً یہ بچوں کے لیے ایک مکمل قاموس بن گیا۔ یہ دونوں کتابیں اس لائق ہیں کہ ان پر درس وتدریس کے ذمہ دار تفصیل سے اظہار خیال کریں اور ان سے استفادہ کی راہ ہموار کریں۔ فاضل مصنف نے شروع میں ''کچھ ضروری باتیں'' لکھ کر ثابت کیا کہ بنگلہ دیش کے خاکستر میں اب بھی کیسی کیسی چنگاریاں ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی، یادوں کے آئینہ میں: ازمولانا عبدالباری (ابوعلی اثری)، ترتیب جناب ارشد علی انصاری اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۹۶، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: عاصم امین، ۱۵/ دلسنگار نزد جامع مسجد، اعظم گڑھ اور نعیم بک سیلر، صدر بازار، مئوناتھ بھنجن، ضلع مئو، یوپی۔

اس کتاب کے مولف کو کبھی خلیل الرحمان اعظمی نے ان خاصان خدا میں شامل کیا تھا جو اپنی گمنامی کو ناموری پر ترجیح دیتے ہیں، یہی کیا مولانا عبدالماجد دریابادی نے دارالمصنّفین کا رخ کرنے والے ایک طالب علم کو نصیحت فرمائی تھی کہ وہاں ابوعلی صاحب سے فائدہ اٹھانا وہ شبلی کی طرز کے کامیاب مقلد ہیں، حق یہ ہے کہ ابوعلی اثری صاحب دارالمصنّفین کی مجسم تاریخ تھے، ان کی زندگی پوری کی پوری اسی آستانہ شبلی وسلیمان کی نذر ہوئی، بظاہر وہ مصحح اور پروف ریڈر تھے لیکن حقیقتاً وہ رفقائے دارالمصنّفین کے مربی ومصلح ومصحح تھے، قدرتاً وہ مولانا دریابادی سے متاثر تھے، بلکہ اس تاثر میں عقیدت اور نیازمندی کا غلبہ تھا اور شاید مولانا دریابادی کا بھی یہی عالم تھا، اسی لیے صدق میں ابوعلی صاحب کی ہر تحریر کی رسائی تھی، زیر نظر کتاب بس ان ہی حقیقتوں کی ترجمان ہے، اس میں خطوط بھی ہیں، چھوٹی بڑی تحریریں ہیں، تبصرے ہیں، مشورے ہیں، گزارشیں ہیں، موضوعات کی اہمیت اپنی جگہ، نثر کی سادگی، سلاست اور شگفتگی کیا ہوتی ہے، یہ کتاب اس لحاظ سے بھی بہت اہم، قابل قدر اور بار بار مطالعہ کے لائق ہے، ان کے فرزند ارجمند نے والد ہی کے انداز میں پیش لفظ لکھ کر اور پھر اس کتاب کو مرتب اور شائع کر کے اپنے حق میں دنیوی واخروی سرفرازیوں کا سامان کرلیا۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، افکار وجہات: مرتبہ ڈاکٹر سلیم قدوائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۶۰، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: اردو بک ریویو، ۳/۱۷۳۹، ذیلی منزل، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۲۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کی شخصیت تدریس، تالیف وتصنیف، تدوین وتنقید، سیاست اور صحافت کے

جلوؤں کی فراوانی تو تھی ہی، اس میں بے باکی، حق گوئی اور پھر علم کی حرمت اور قلم کی شرافت کا عجب امتزاج تھا، پارلیمنٹ کے برسوں ممبر رہ کر انہوں نے پارلیمانی وقار کی جس طرح ترجمانی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بظاہر خاموش لیکن جب کسی مسئلہ پر اظہار خیال کی ضرورت ہوتی تو پھر ان کی گفتگو کی رفتار اور اس کی متانت دیکھنے کے لائق ہوتی، مطالعہ میں بہتوں نے مثالیں قائم کیں لیکن قدوائی مرحوم کے لیے زندگی کا مترادف دوسرا لفظ صرف مطالعہ کتب ہی تھا، قوم وملت کو ایسے خاموش خدمت گزاروں کے بارے میں جاننے اور ان کو سمجھنے کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے، قدوائی مرحوم اپنے شاگردوں کو کچھ بنانے اور سنوارنے کے لیے مشہور تھے، ان کی زندگی کے حالات سے یہی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اسی غرض سے ان کے نامور صاحبزادہ ڈاکٹر سلیم قدوائی نے صحیح سوچا کہ وہ تو ہمارے والد تھے لیکن دنیا نے ان کو کس نظر سے دیکھا، یہ بھی دیکھنا چاہیے، یہ کتاب اسی غرض سے مرتب ہوئی جس میں مولانا سید محمد رابع ندوی، پروفیسر ریاض الرحمان شروانی اور ملک کے متعدد مشاہیر کی تحریریں یکجا کردی گئی ہیں، ضرورت تو ایک مفصل اور مبسوط تذکرہ کی ہے لیکن سردست زیر نظر کوشش، افادیت میں کم نہیں۔

بنواس: از جناب شکیل اعظمی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۰، قیمت ۳۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-۶/ اور دہلی، الہ آباد، علی گڑھ، پٹنہ، ممبئی، حیدرآباد، اورنگ آباد، کولکاتا، جموں توی، کشمیر اور احمد آباد کے مشہور مکتبے۔

۱۹۹۶ء میں ایک غیر معروف نوجوان ونوخیز شاعر کا پہلا مجموعۂ کلام دھوپ دریا کے نام سے آیا، شعری مجموعوں کی کثرت میں یہ وحدت حیرت انگیز نہیں تھی لیکن جب پہلا صفحہ اس ماں کے نام دیکھا جو موت کی راہ پر چل کر بیٹے کو زندگی کا سب سے بڑا المیہ دے گئی اور بیٹے کو یہ احساس بھی دے گئی کہ ''کبھی سوتے میں ایسا لگتا ہے۔سر کے نیچے تری ہتھیلی ہے''، تو اس پہلے صفحہ سے اندازہ ہوا کہ شاعر کچھ الگ اور جدا سا ہے، اس وقت معارف نے دھوپ دریا کی جدت، تازگی، انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر شاعر یہ کہتا ہے کہ ع جی میں آیا ہے کہ جذبات کا سودا کرلوں۔تو یقیناً اس سودے میں اردو شاعری کو نفع ہوا ہے، ستائیس سال ہونے کو آئے، اس عرصہ میں شکیل اعظمی کی شاعری نے اردو کو چھ اور مجموعے دیے، ان سب میں صفت مشترک، انفرادیت ہی رہی اور اب زیر نظر ''بنواس'' نے اس انفرادیت کو اس مقام پر لا دیا ہے جہاں صرف حیرت اور اس کی فراوانی ہے، ''بنواس یا بن باس'' کا لفظ ہندوستانی ادبیات میں ایک مذہبی استعارہ کی شکل میں رامائن یا رام کے جیون کی ایک اساطیری داستان کے سارے رموز، ساری علامتوں اور

سارے مفاہیم کے روشن دریچہ کے مانند ہے، رامائن کے رزمیہ کی مذہبی حیثیت سے قطع نظر اس کا انسانی واخلاقی پہلو شروع سے آخر تک فلسفہ اجتماع اور فلسفہ نفسیات کی گرہوں کو کھولنے میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے، باپ، ماں، بھائی، بیوی، بچے، دوست، دشمن، یہ سارے ازلی کردار رامائن کی داستان میں صدیوں سے اپنے وجود کے بنتے بگڑتے عکس کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جسے صرف عالم حیرت ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، داستان کو دیکھنے میں لوگوں کا انداز نظر ظاہر ہے مختلف رہا ہے، چکبست اور فراقی دریابادی کی رامائنوں کو مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن شکیل اعظمی نے جنگل، سناٹا، تاریکی، بے سمتی اور اچانک کسی گوشے سے ابھرتی ملگجی روشنی اور پھر تھکی ہاری زندگی کو بہر حال پالینے اور جی لینے کی تمنا اور کوشش کو دوسرا ہی رنگ دے دیا، ابھی شاعر کی عمر ہی کیا لیکن زندگی کے بنواس پن کو کتنے قریب اور قرینے سے دیکھنے کا دعویٰ کیا گیا کہ:

ہزاروں سال تک سناٹے کو سنتا رہا چپ چاپ ‏ ‏ ‏ ‏ میں اس کے بعد کہنے داستاں جنگل سے نکلا تھا

یہی نہیں جنگل سے خاموش وحشت کا نکلنا، پیڑوں کے کٹے ہاتھوں کے نتیجہ میں دعا کا جنگل سے غائب ہونا، بستیوں کے بسنے میں جنگل سے اشجار کی ہجرت، یہ نئی سوچ کی وہ علامتیں ہیں جو اردو شاعری کو ایسے رنگ دیتی ہیں جو روایتی رنگوں سے بالکل ہی مختلف ہیں، بنواس میں وحدت بھی ہے اور ثنویت بھی بلکہ تکثیریت ہی، ایک حصہ نظم کا ہے جس میں بھرت، ارملا، لکشمن، شبری، بالی، سگریو یعنی رام کی دنیا کی ہر طرح کی وہ مخلوق ہے جو جنگل سے وابستہ ہے، ہندوستانی داستان کے لیے جنگل ضروری ہے ورنہ زمین مختلف ہوتی تو ریت، رنگ، صحرا، دریا، سمندر بھی کچھ ایسے ہی کرداروں کے مدعی ہوتے، نظموں کے سلسلہ کی آخری کڑی وہ ہے جہاں شاعر ساری کیفیتوں سے شناسائی کے بعد صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ پیڑ کبھی نہیں مرتا، درختوں کو ماحولیات کے پس منظر میں دیکھنے والے بھی ہیں مگر ہمارا شاعر صرف ماحولیات سے ماورائیت کی راہوں کا مسافر ہے، اس لیے جب وہ غزل کی تکنیک پر آتا ہے تو پھر موسم کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔

شہر بہت پاگل ہے لیکن دیوانہ ہے جنگل بھی ‏ ‏ ‏ ‏ کہہ کر دیکھو، سن کر دیکھو، افسانہ ہے جنگل بھی

صحرا اور سمندر میرے ہاتھوں پیروں سے واقف ‏ ‏ ‏ ‏ چپہ چپہ میرا جانا پہچانا ہے جنگل بھی

دل اجڑے تو ساری دنیا اجڑی اجڑی لگتی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ گھر بھی ہے اجنبیوں جیسا، بیگانہ ہے جنگل بھی

کتنے بے رشتہ ہیں تینوں اپنے اپنے رشتوں میں ‏ ‏ ‏ ‏ بھیڑ میں بھی تنہا رہتے ہیں، سناٹا جنگل اور میں

شافع قدوائی نے شکیل کو بجا طور پر جنگل کا تخلیقی رزمیہ نگار کا نام دیا اور اس کی تشریح جس طرح چوبیس صفحات میں کی ہے اس نے بنواس کی معنویت میں محویت کو واقعی بہت گہرائی دے دی، بنواس کو

پڑھنے سے روح کو نشاط ہی حاصل ہوگا، وہی نشاط جو زندگی کا حاصل ہے۔

بنام نرگس بقلم عبدالرحمٰن انتولے: ترتیب نیلم انتولے، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۷۶، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: اردو چینل ۱۲۱/۳، ۷، گجانن کالونی، ممبئی۔ ۴۳۔

وقت کس طرح دیکھتے دیکھتے چہروں کو پس غبار کرتا گزر جاتا ہے، اس حقیقت کا مشاہدہ بار بار ہوتا رہتا ہے، عبدالرحمٰن انتولے چند دہائیوں پہلے مہاراشٹر بلکہ ہندوستان کی سیاست اور برسر اقتدار کانگریس پارٹی میں عزت و احترام کی بلند منزلوں پر نظر آتے تھے، مہاراشٹر کے وہ وزیر اعلیٰ ہوئے اور یہ کہنے میں جتنا آسان ہے سمجھنے میں اتنا ہی مشکل ہے، ان کی سیاسی زندگی بڑی متحرک رہی، لیکن اس کتاب سے انتولے صاحب کی زندگی کا وہ گوشہ روشن ہوا جس کی طرف شاید ہی نظر جاتی یعنی وہ خطوط میں اپنی اہلیہ کے ساتھ جس طرح اپنی شخصیت کی پرتیں کھولتے ہیں وہ محض ایک شوہر کے جذبات نہیں بلکہ بیوی کی اہمیت، اس سے محبت، اس کا احترام اور اس کی معاشرتی اور خانگی ضرورت کا اظہار کچھ اس خوبی سے ہوتا ہے کہ بیوی نرگس کے ساتھ خود انتولے اپنے دیدہ ور ہونے کا ثبوت دیتے جاتے ہیں، انتولے صاحب کی اردو پر دسترس بھی اس کتاب سے معلوم ہوئی، تقریر کی داد مشہور لیڈر یشونت راؤ چوہان نے یہ کہہ کر دی کہ ''تمہاری تقریر کے بعد سبھی لیڈران پوچھ رہے تھے کہ کیا وہ یوپی کے ہیں، لیکن میں نے کہا نہیں وہ ہمارے مہاراشٹر کے ہیں''، اردو پر فخر و ناز کے وہ بھی کیا دن تھے، چوہان جی کا یہ تاثر ۱۹۵۸ء کا ہے، وقت کی آواز سننے کے لیے بھی دردمند دل کا ساتھ ضروری ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں اور قلم بند تقریروں کا پورا سیٹ تمہیں تحفتاً بھیجنا چاہتا ہوں، مولانا کا انداز تحریر بے نظیر ہے''، مولانا آزاد کا انتقال ہوا تو لکھا ''اس سانحہ سے ملک اور قوم کو جو عظیم نقصان پہنچا وہ اپنی جگہ پر زبردست ضرور ہے لیکن ان کی موت سے مسلمانان ہند پر جو آفت ناگہانی آپڑی ہے اسے سوچنے سے دماغ قاصر ہے، اللہ پاک ہم سب کو ان کی تعلیمات کی روشنی میں صالح زندگی گزارنے کی توفیق دے، اہلیہ کسی امتحان کی تیاری کر رہی تھیں تو لکھا کہ ''جب امتحان دینے گھر سے نکلو تو ہر روز یہ دعا پڑھو، کسی کاغذ پر لکھ لو بسم اللہ توکلت علی اللہ، لا حول و لا قوۃ الا باللہ، امتحان ہال میں داخل ہوتے وقت بسم اللہ پڑھ کے سورۂ اخلاص ضرور پڑھو اور پرچہ ہاتھ میں لینے سے قبل یہ پڑھو، اگر یاد رہے ألیس اللہ بکاف عبدہ، یہ تھے عبدالرحمٰن انتولے، قوم اپنی شامت اعمال کے اسباب کو جب دیکھے گی تو سمجھ میں آئے گا کہ ناقدری اور ناشکری سب سے بڑا سبب ہے، عبدالرحمٰن انتولے کے بارے میں گوپی چند نارنگ نے صحیح لکھا کہ یہ مجموعہ خطوط اردو ادب میں ایک یادگار اضافہ ہے، یہ بھی کہنا جائز ہوگا کہ یہ ایک آئینہ بھی ہے جس سے آنکھیں ملانے کی جرأت کئی صاحب جبہ و دستار بھی نہیں کر سکتے۔

ع۔ص

رسید کتب موصولہ

امانت: ڈاکٹر چودھری مسرور علی خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

قیمت: ۳۴۰ روپے

تصانیف شبلی کے تراجم: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مکتبہ دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

قیمت: ۴۰۰ روپے

حیات قطب الہند حضرت منورویؒ (اول و دوم): مولانا اختر امام عادل قاسمی، مکتبۃ الامام، شاہین باغ، ابوالفضل انکلیو پارٹ ۲، جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی۔

قیمت ہر جلد: ۱۳۰۰ روپے

دستک شمارہ ۷ (کبیر نمبر): پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس۔

قیمت: ۳۰۰ روپے

دیدہ ور: جناب اختر اعظمی، مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی۔

قیمت: ۲۵۰ روپے

رشید حسن خاں کے تبصرے اور تجزیے (جلد اول): جناب ابراہیم افسر، دانش محل، لکھنؤ۔

قیمت: ۴۸۰ روپے

سب رنگ: جناب طفیل انصاری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔

قیمت: ۱۷۸ روپے

سرگزشت حیات: ڈاکٹر محمد ابواللیث خیر آبادی، مرتب ضیاء الحق خیر آبادی، مکتبہ احسان، لکھنؤ۔

قیمت: ۳۰۰ روپے

قومی یکجہتی کا منظر نامہ: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور، مہاراشٹر۔

قیمت: ۲۰۰ روپے

گناہ کی کھیتی: جناب ابوالکلام رحمانی، ڈائمنڈ آرٹ پریس، بینٹنک اسٹریٹ، کوکاتا۔

قیمت: ۲۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ		اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-	سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی		کلیات شبلی (اردو)	220/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	کلیات شبلی (فارسی)	45/-
الفاروق	350/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
الغزالی	200/-	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
المامون	175/-	مقالات شبلی دوم (ادبی) //	70/-
سیرۃ النعمان	300/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی) //	80/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) //	200/-
شعرالعجم اول	300/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی) //	150/-
شعرالعجم دوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی) //	90/-
شعرالعجم سوم	125/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) //	100/-
شعرالعجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) //	110/-
شعرالعجم پنجم	150/-	خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-	انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی		مکاتیب شبلی اول //	150/-
الکلام	250/-	مکاتیب شبلی دوم //	190/-
علم الکلام	200/-	اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Maarif (Urdu) -Print
SEPTEMBER 2021 Vo- 208 (3)
RNI.13667/57 MAARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibi Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)